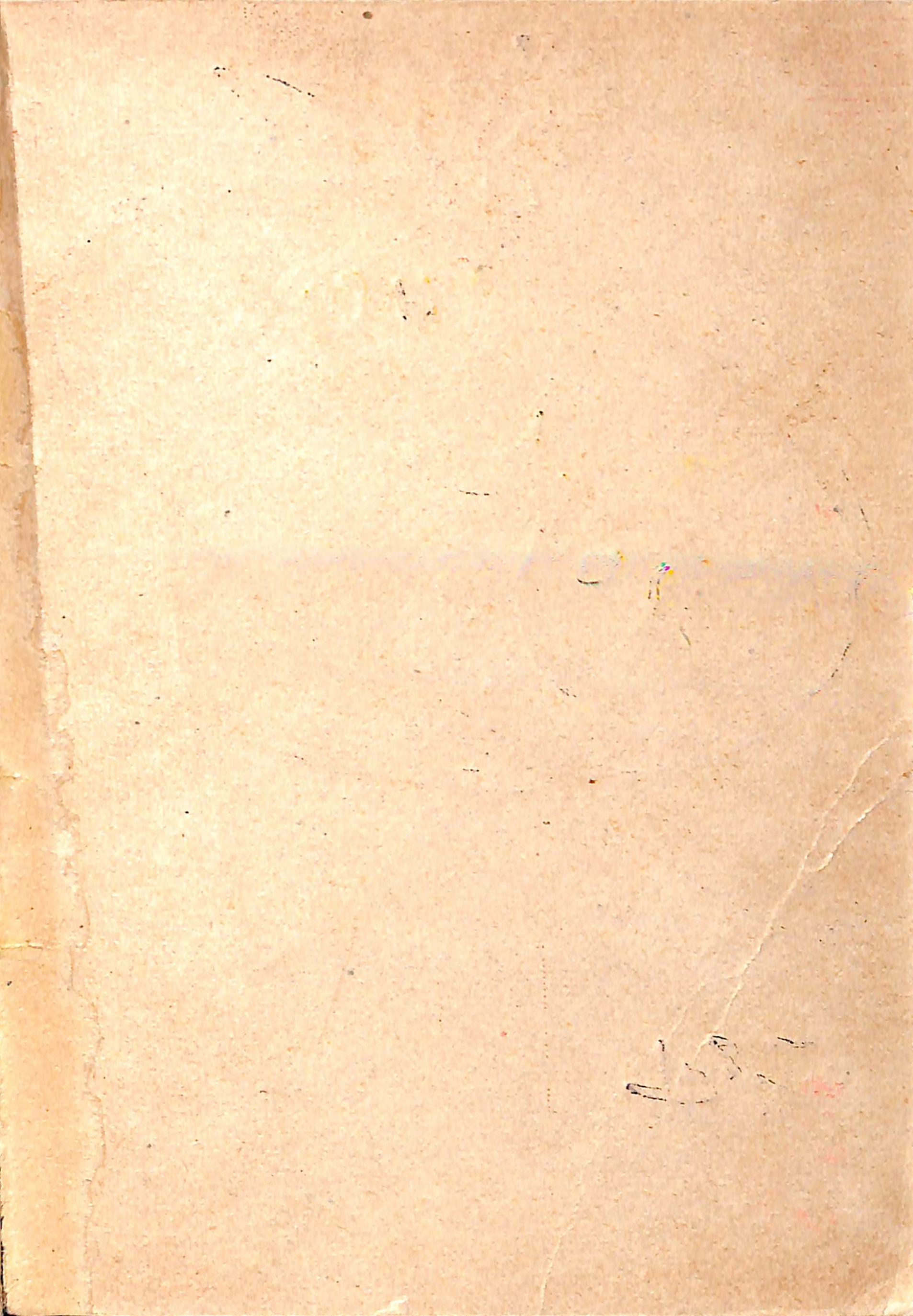
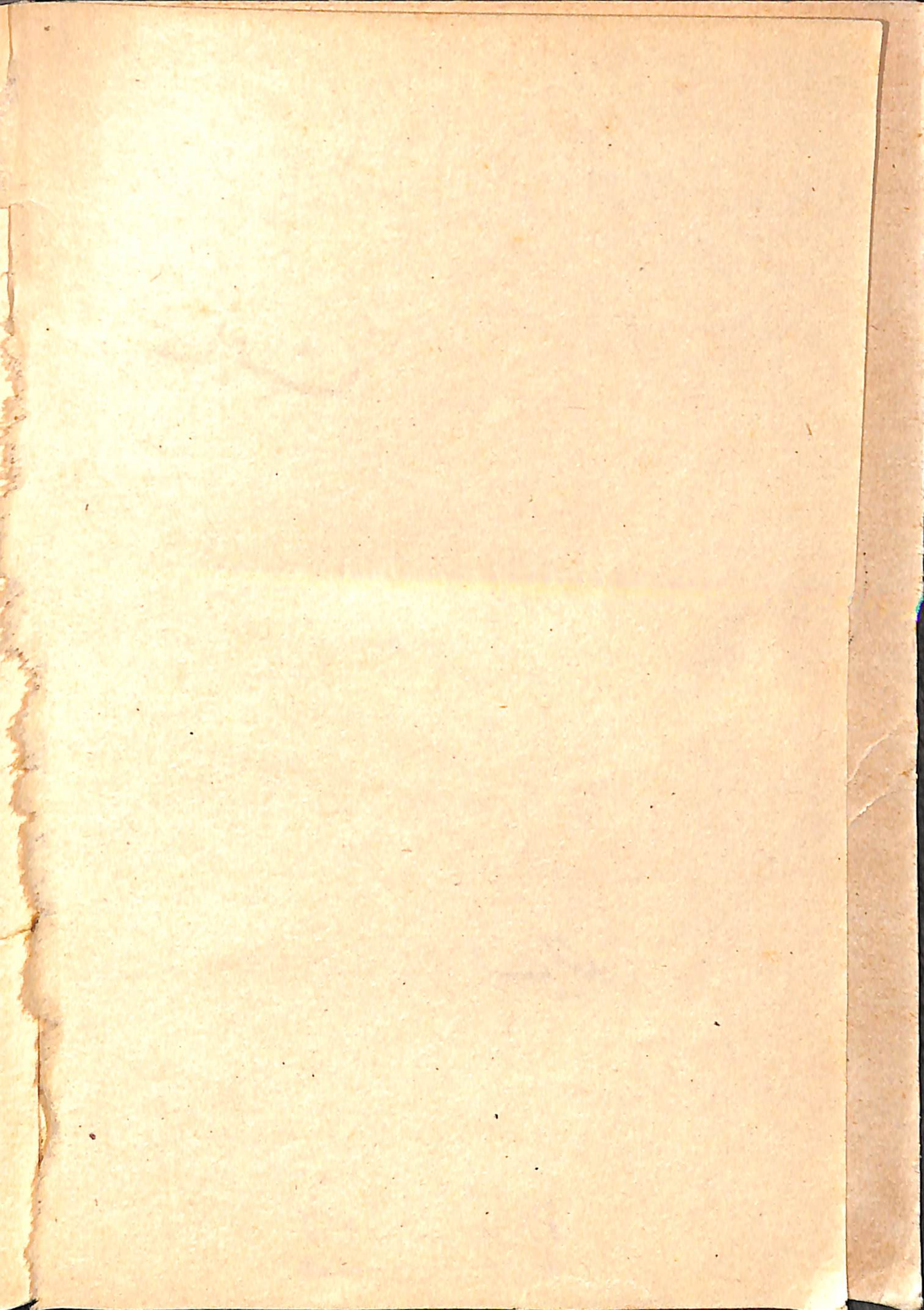
اے حمید



غبن

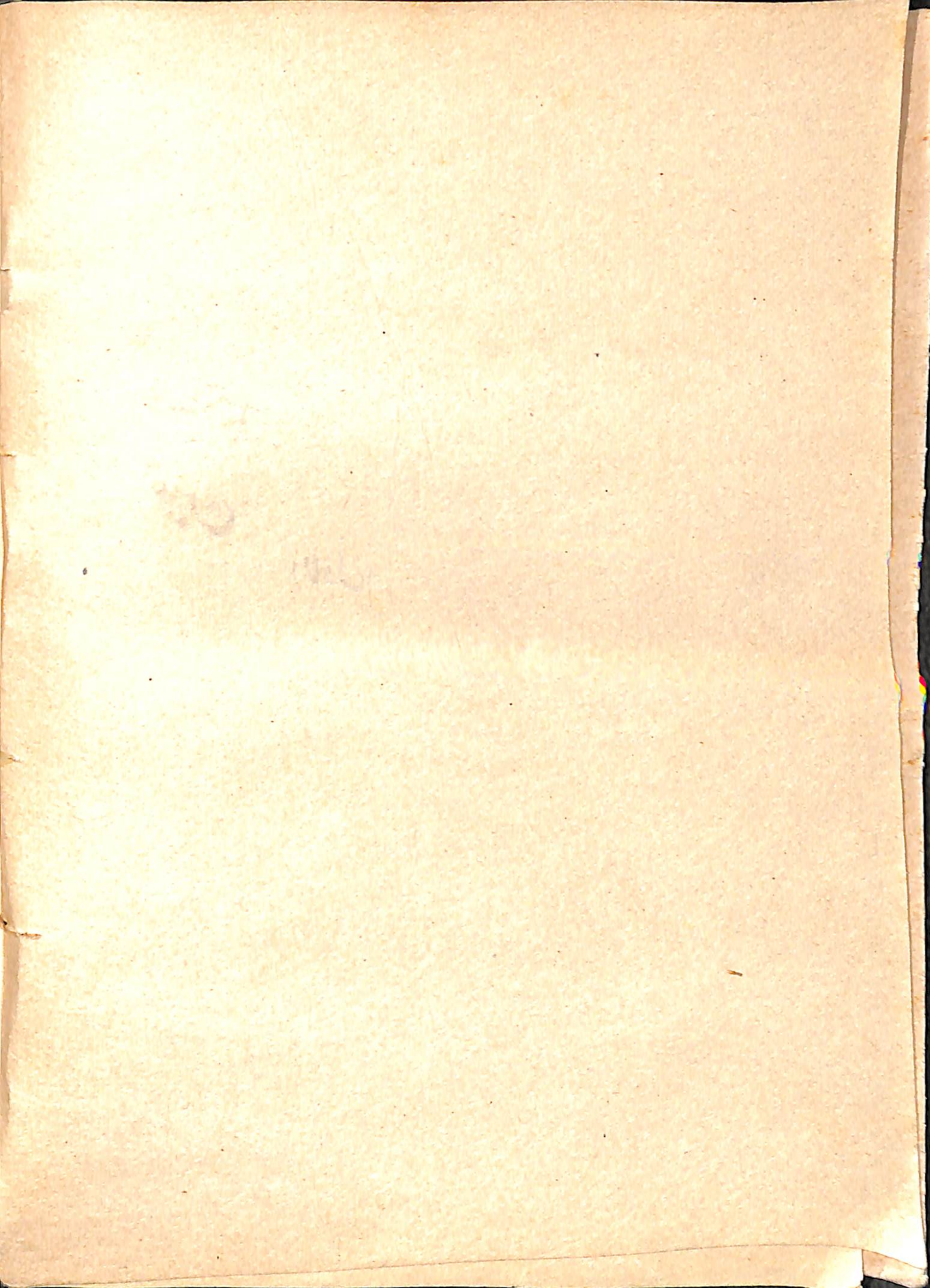
اے حمید



اے حمید

غبن

(ناول)



ناول

غبن

اے حمید

پرنٹر — بشیر احمد میاں

پبلشر — خالد بکڈپو چوک، انارکلی، لاہور

کتابت — ن۔ معروف

مطبع — اشرف پریس لاہور

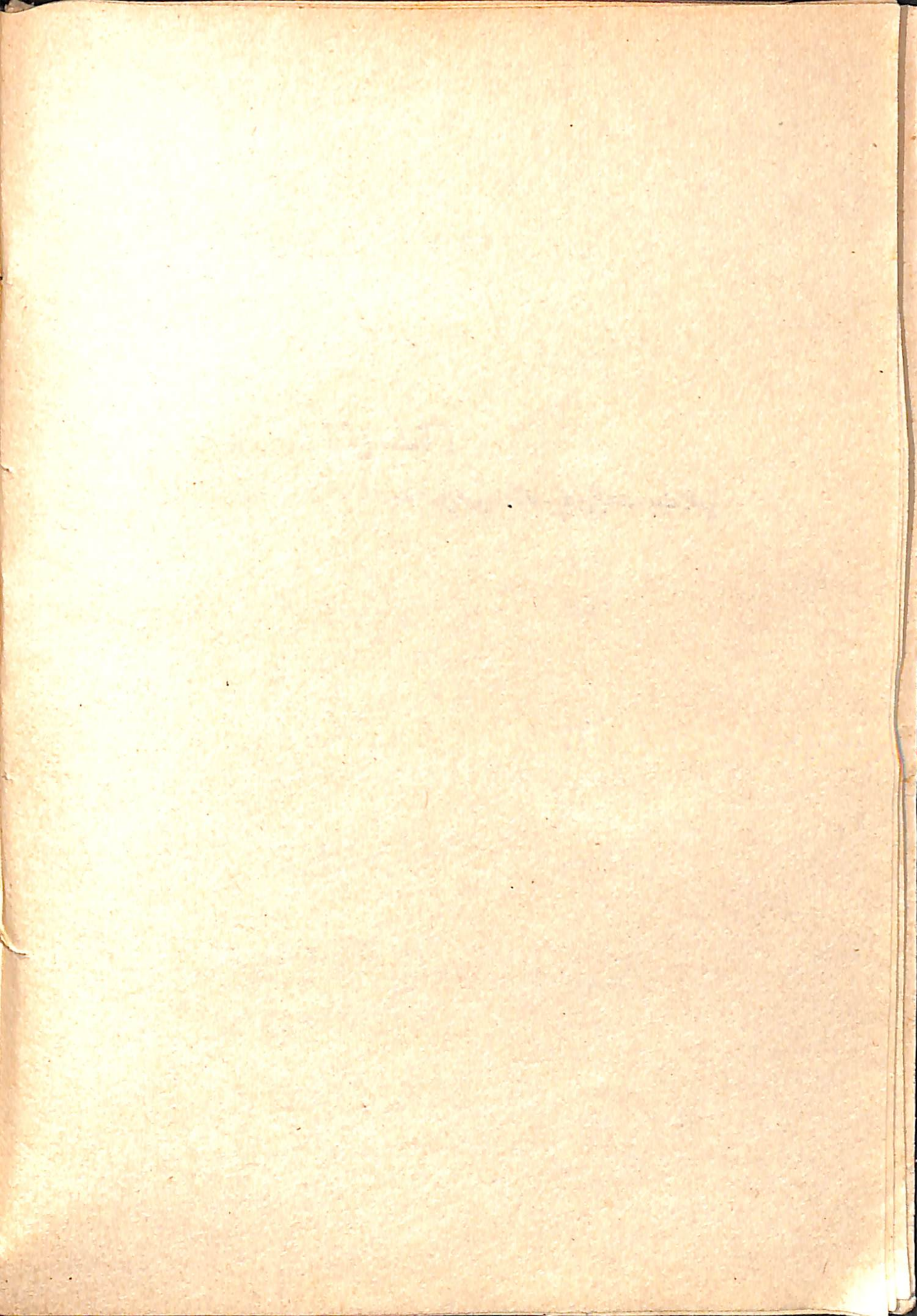
تاریخ اشاعت — جولائی ۱۹۶۴ء

قیمت :- مجلد تین روپے
غیر مجلد دو روپے پچاس پیسے

(تعداد ایک ہزار)

زری کے نام

جس کی سوئی ہوئی مامتا کو بچے کی محبت نے جگا دیا۔



۱

ریل گاڑی پورے دو بجے دوپہر راولپنڈی پہنچ گئی۔

میں نے اپنا اٹیچی کیس اٹھایا اور پلیٹ فارم پر گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کے دفتر کی طرف چل پڑا۔ ایک قلی نے لپک کر کہا "میں اٹھالوں صاحب؟" میں نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا اور کہا "میں بھی قلی ہوں بھائی۔ قلی بھی مسکرا دیا۔ شاید وہ سمجھ گیا تھا کہ بابو جھوٹ بول رہا ہے۔ گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کی مری جانے والی بسیں سٹیشن ہی سے چلتی ہیں۔ ان کے دفتر کو ایک راستہ پلیٹ فارم سے بھی جاتا ہے۔ اگر آپ بغیر ٹکٹ ریل میں سفر کر رہے ہوں اور راستے میں آپ کی چیکنگ نہ ہو تو آپ بڑی آسانی کے ساتھ اس راستے سے باہر نکل سکتے ہیں۔ ایک بار میں نے لاہور سے پنڈی تک بغیر ٹکٹ سفر کیا تھا۔ تو اسی راستے سے سیٹی بجاتا باہر نکل گیا تھا۔

گورنمنٹ ٹرانسپورٹ کے دفتر میں مری جانے والے کچھ لوگ پہلے ہی سے اپنے اپنے سامان کے پاس بیٹھے انتظار کی گھڑیاں گن رہے تھے۔ چھت کے درمیان میں

لگا ہوا پنکھا پوری رفتار سے چل رہا تھا۔ پھر بھی گرمی کے مارے لوگوں کا دم نکلا جا رہا تھا۔ لوگوں کا دم ذرا ذرا سی بات پر دم نکل جاتا ہے ۔ ذرا سردی ہوئی تو دم نکلنے لگا۔ ذرا گرمی ہوئی تو دم نکلنے لگا۔ ذرا زیادہ بارش ہو گئی تو دم نکل گیا۔

میں نے اٹیچی کیس دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ ایک ٹوٹی ہوئی کرسی خالی پڑی تھی۔ میں اس پر بیٹھ گیا اور اطمینان سے سگریٹ پینے لگا۔ ٹکٹ دینے والے کاؤنٹر پر ایک بورڈ لگا تھا۔ جہاں پہاڑ کے درختوں بھرے پر فضا راستے پر ایک لاری کو جاتے دکھایا گیا تھا۔ ظاہر ہے یہ لاری گورنمنٹ ٹرانسپورٹ والوں کی تھی۔

باہر دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ ہوا گرم ہو کر اندر آ رہی تھی۔ پنکھے کی ہوا کے باوجود قمیض پسینے میں گیلی ہو رہی تھی۔ لاہور سے پنڈی تک چھ گھنٹے کے سفر نے حلیہ بدل کر رکھ دیا تھا۔ بالوں میں گرد جما تھا۔ چہرہ اور ہاتھ مٹی اور پسینے سے میلے ہو رہے تھے۔ میں نے جیب سے میلا رومال نکال کر اچھی طرح سے منہ پونچھا۔ نیا سگریٹ سلگایا اور اس طرف دیکھنے لگا جہاں ابھی ابھی ایک فیملی نے آ کر اپنا سامان رکھا تھا۔ یہ کنبہ دو ادھیڑ عمر کی عورتوں، ایک ادھیڑ عمر کے مرد، دو نوجوان لڑکوں، دو نوجوان لڑکیوں اور کئی قسم کی لڑکیوں پر مشتمل تھا۔ سامان کا ڈھیر انہوں نے کونے میں لگا دیا تھا۔ اور ہر کوئی بار بار تھرمس میں سے پانی نکال کر پی رہا تھا۔ لوگ خوشحال خاندان کے معلوم ہوتے تھے۔ لڑکیوں نے چست قمیض، شلواریں پہن رکھی تھیں۔ کٹے ہوئے بال کھوپڑی پر اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ بھنویں کھنچی ہوئی تھیں اور ہونٹوں پر ریڈ انڈین کلر کی ہلکی گلابی

لپ سٹک کی تہہ جمی تھی

آدمی بوسکی کی قمیضوں اور پتلونوں میں ملبوس تھے۔ نوعمر لڑکوں کا لباس ٹیڈی تھا یعنی میرون کلر کی ٹی شرٹ تنگ جینز اور بکسوئے والا سیاہ بوٹ۔ ادھیڑ عمر کی عورتوں پر بھی جوانی کا غلبہ تھا۔ پھولدار ویل کی تنگ قمیضیں جن میں سے انکا تھل تھل کرتا بدن باہر کو بہہ رہا تھا۔ کٹے ہوئے بال اور جاپانی پنکھے سے سرخی پاوڈر ملے چہرے کو ہوا کر رہی تھیں۔ اور پانی پانی چلا رہی تھیں۔ ان کے دفتر میں آنے سے فضا کی بوریت کم ہوگئی۔ ہر شخص انہیں دیکھنے لگا۔ نوجوان لڑکیوں کی قمیضیں پسینے سے تربتر تھیں۔ وہ پارے کی طرح ادھر ادھر حرکت کر رہی تھیں۔ اور انہیں ایک پل کو قرار نہ تھا۔ ٹکٹ کلرک بیچارہ گھبرا سا گیا۔ اور اس کا پنسل رجسٹر پر بار بار پھسل جاتا تھا۔

ایک لڑکی کی ناک بیٹھی ہوئی تھی۔ مگر سینہ اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔ دوسری لڑکی کی ناک اوپر کو اٹھی ہوئی تھی اور جسم بھی کبوتر کی طرح اوپر کو اڑنے کو بے تاب تھا۔ اگر یہ کبوتر پھڑپھڑا کر قمیض میں سے نکل اڑ جائے تو کہاں جائے گا؟ مجھے یہ لڑکی پسند آگئی اور میں نے اس سے عشق لڑانے کا فیصلہ کرلیا۔ میں جانتا تھا کہ یہ لوگ بھی مری جا رہے ہیں اور مری کی مال روڈ پر اس لڑکی کو تلاش کرنا کوئی زیادہ مشکل کام نہیں۔ ایسی لڑکیاں خود بخود مردوں کی طرف کھنچی چلی آتی ہیں۔

اس کا رنگ گورا تھا۔ آنکھیں تیکھی اور نشیلی تھیں اس نے بھنویں بنا رکھی تھیں۔ بالوں کا سر پر گھونسلہ سا بنا تھا۔ درمیان میں بالوں کا ایک گچھا اوپر کو اٹھا ہوا تھا۔ شاید اس گھونسلے میں بھی کوئی کبوتر مائل پرواز تھا۔ میں ایک ہی منٹ میں اس لڑکی پر عاشق ہوگیا۔ آج کل لڑکیوں پر عاشق

ہونے میں ذرا دیر نہیں لگتی - وہ زمانے گئے جب عاشق ہونے کے لئے نگاہوں کا ملنا بجلی کا گرنا اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اشاروں کا تبادلہ ضروری تھا - اب تو لڑکی نہ بھی دیکھے تو لڑکا عاشق ہو سکتا ہے - چنانچہ اس لڑکی نے بھی مجھے ابھی نہیں دیکھا تھا - اور یہ خاکسار اس پر عاشق ہو گیا تھا -

اسے میری طرف دیکھنے کی ضرورت بھی کیا تھی - میں تو عام قمیض پتلون میں ملبوس میلا کچیلا سا بنا بس کمپنی کے دفتر میں ایک طرف چپ چاپ بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا - میرا اٹیچی کیس بھی میری پتلون کی طرح گندا ہو رہا تھا - کیونکہ راستے میں ریل کے ڈبے میں ایک عورت نے میرے اٹیچی کیس پر چاول ڈال کر اپنے بچے کو کھلائے تھے - بس پورے تین بجے وہاں سے روانہ ہو رہی تھی - تین بج گئے تھے - اور بس ابھی تک نہیں آئی تھی - کلرک بار بار شہر والے دفتر میں فون کر رہا تھا -

" ہیلو بھئی بہتر کب آ رہی ہے جناب ؟ "

پھر وہ ناامید ہو کر فون بند کر دیتا - لوگ پر امید نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے اور وہ رجسٹر کی ورق گردانی کرتے ہوئے صرف اتنا کہہ کر خاموش ہو جاتا کہ بس ورکشاپ سے چل پڑی ہے - اس دوران میں لڑکی نے دو ایک بار میری طرف دیکھ لیا تھا - پہلی بار حیرانی سے اور دوسری بار غصے میں - ..... حیرانی سے اس لئے کہ اس میلے کچیلے غریب سے لڑکے کو اتنی جرات کیسے ہوئی کہ وہ ایک ماڈرن لڑکی سے آنکھیں چار کرے - اور غصے میں اس لئے کہ اسے اس میں اپنی توہین محسوس ہوئی تھی - بہر حال میں ثابت قدمی سے اس

کی طرف بار بار دیکھ کر مسکرا رہا تھا کیونکہ میرے استاد نے مجھے عشق کے معاملے میں اسی قسم کی تربیت دی تھی۔

ایک بار اس نے مسکرا کر اپنی بیٹھی ہوئی ناک والی بہن کے کان میں کچھ کہا۔ اس لڑکی نے بھی میری طرف دیکھا اور پھر دونوں ہنس پڑیں اور دوسری طرف منہ کر لیا۔ میں نے دل میں کہا کوئی بات نہیں مری چل کر بات ہو گی۔ یہاں میں کچھ نہیں کر سکتا۔ ساڑھے تین بجے فیصلہ کیا گیا کہ چونکہ پنڈی سے مری جانے والی بس نہیں آ رہی اس لئے جو بس چار بجے مظفر آباد جا رہی ہے اسے ساڑھے تین بجے مری کی طرف روانہ کر دیا جائے۔

مسافر دھڑا دھڑ اس بس میں سوار ہونے لگے۔ جب ڈرائیور کو معلوم ہوا کہ اسے وقت سے آدھ گھنٹہ پہلے روانہ کیا جا رہا ہے تو اس نے غصے سے لاری کے انجن پر زور سے لات ماری۔

"اس بیکار بس کو لے کر میں کہاں جاؤں گا؟"

ایک سنجی سے عینک پوش مسافر نے کہا۔

"کوہ مری جناب"

ڈرائیور غصے میں سوار ہوا اور ایک زبردست دھچکے سے بس کو لے کر روانہ ہو گیا۔ سارے مسافر ڈر گئے۔ یا اللہ خیر ـــــ ڈرائیور کے تیور اچھے نہیں اور سفر پہاڑی ہے۔ ٹیڈی فیملی بس کے بائیں جانب اگلی سیٹوں پر براجمان تھی۔ اٹھی ہوئی ناک والی ٹیڈی لڑکی فرنٹ سیٹ پر بیٹھی تھی اور میں دائیں جانب ڈرائیور کی پچھلی سیٹ پر تھا۔ یعنی وہ لڑکی جب بھی ذرا گردن اس طرف

کرکے اپنی ماں سے بات کرتی تو خواہ مخواہ اس کی نظر مجھ پر پڑ جاتی ۔ اور میں تو اسے ہر دو منٹ بعد دیکھتا تھا ۔ کیونکہ آدمی اگر عشق میں ڈھیٹ ہو جائے تو وہ ایک نہ ایک دن ضرور نہ کامیاب ہو جاتا ہے ۔ میں بھی ڈھیٹ بن گیا تھا ۔ اور لڑکی کے غصے کی پرواہ کئے بغیر بے شرموں کی طرح اس کی طرف دیکھ کر برابر مسکرائے جا رہا تھا ۔

بس اب پنڈی شہر کے قصبیوں سے باہر نکل آئی تھی ۔ اور مری روڈ پر بھاگی چلی جا رہی تھی ۔ راول ڈیم سے آگے نکل کر وہ چھتر کے لوکاٹ کے باغات کو بھی پیچھے چھوڑ گئی اور اب پہاڑ کی ہلکی ہلکی اترائی چڑھائی شروع ہو گئی تھی ۔ ڈرائیور کے چہرے پر ابھی تک غصہ اور بوریت کے اثرات تھے ۔ اس کے ہونٹ بھینچے تھے ۔ اور انگلیاں سکڑی ہوئی تھیں ۔ وہ کسی سے بات نہیں کر رہا تھا اور کسی کی بات کا جواب بھی نہیں دے رہا تھا ۔ ترپٹ سے کوئی ایک میل آگے جا کر بس خراب ہو گئی ۔

ڈرائیور نے ایک گالی دی اور انجن بند کر کے نیچے اتر آیا اور پچھلے پہیوں کے پاس بیٹھ کر نیچے دیکھنے لگا ۔

"اوئے علی محمد بکسے میں سے دو نٹ لانا پہلے کہا تھا کہ یہ بس نہیں چلے گی"

مسافروں پر گویا اوس پڑ گئی ۔ انہیں پہلے ہی خدشہ تھا کہ ڈرائیور کے تیور اچھے نہیں ہیں کچھ نہ کچھ ضرور ہو کر رہے گا ۔ ڈرائیور اپنے کلینر کو لے کر بس کے نیچے گھس گیا ۔ اور کوئی بیس منٹ تک ٹھک ٹھک کرتا رہا ۔ گرمی کے مارے مسافروں کا برا حال ہو گیا ۔ دھوپ بڑی تیز پڑ رہی تھی ہوا بالکل بند تھی ۔ ارد گرد کوئی درخت بھی نہیں تھا چیڑھ کی قطاریں اوپر پہاڑ کی چڑھائی پر جا کر شروع

ہوتی تھیں۔

ٹیلی فیملی نے پنکھے جھلنے اور تھرمس سے بار بار ٹھنڈا پانی پینا شروع کر دیا۔ اٹھی ہوئی رومن ناک والی لڑکی یعنی میری محبوبہ کو بھی پسینہ آ رہا تھا۔ اور وہ ننھے سے رومال سے بار بار اپنا گورا مکھڑا پونچھ رہی تھی۔ اگر وہ رومال اس وقت مجھے دے دیتی اور میں اسے سونگھتا تو اس میں سے یقیناً یارڈلے اور پونڈز کریم کی ملی جلی مہک آ رہی ہوتی۔ عورت کا پسینہ جب یارڈلے کے پھولوں میں مل جائے تو وہ خوشبودار ہو جاتا ہے۔ اس کی قمیض پھر سے بھیگ گئی تھی اور کبوتروں کا بھی گرمی کے مارے دم گھٹ رہا تھا۔ کیا ہی اچھا ہو اگر یہ لڑکی ان کبوتروں کو آزاد کر دے اور وہ تریت پہاڑ کی کھلی ہواؤں میں اڑتے پھریں۔

بس ٹھیک ہو گئی۔ مسافروں نے اطمینان کا سانس لیا۔ ڈرائیور نے ایک موٹی سی گالی ٹرانسپورٹ کے منتظمین کو دی اور ایک کرائنی سیٹ پر آن بیٹھا۔ انجن سٹارٹ کر کے اس نے گیئر لگایا اور بس گھوں گھوں کرتی اوپر چڑھائی پر چڑھنے لگی۔ چھرہ پانی پیچھے رہ گیا تو بس آہستہ آہستہ ائیر کنڈیشنڈ ہونے لگی۔ ہواؤں کے جھونکے چلنے لگے اور چیڑھ کی خوشبوئیں ادھر ادھر سے آنے لگیں۔ فضا خوشگوار سے خوشگوار تر ہونے لگی۔ میدانوں کی جھلسا دینے والی گرمی پیچھے رہ گئی تھی۔ اور پہاڑوں کی ٹھنڈی ہوائیں ہمارے خیر مقدم کو آگے بڑھ رہی تھیں۔ ٹیڈی لڑکی کے چہرے پر بھی رونق آ گئی تھی۔ زرد رنگ پر سرخی جھلکنے لگی تھی اور وہ بار بار مسکرا کر اپنی چھوٹی بہن اور ماں سے باتیں کرنے لگی تھی۔ انسان پر موسم کا سب سے زیادہ اثر ہوتا ہے۔ چلچلاتی دھوپ میں اگر ایک دم کالی گھٹا جھوم اٹھے اور ٹھنڈی ہواؤں کے ساتھ بارش شروع ہو جائے

تو بجھے ہوئے دل بھی ایک بار مسکرا اٹھتے ہیں۔

کلنٹی باغ پہنچ کر بس کھڑی ہو گئی۔ ہوٹلوں میں ریڈیو پر گانے ہو رہے تھے۔ نل میں سے چشمے کا ٹھنڈا، ہلکا اور شیریں پانی اچھل اچھل کر گر رہا تھا۔ لڑکے پانی کا ٹین بھر بھر کر لاتے اور موٹر کے پہیوں پر اچھال دیتے۔ گاڑی کو غسل دیا جانے لگا۔ گرم انجن ٹھنڈے پانی سے سسکارنے لگا۔ ڈرائیور چائے پینے چلا گیا۔ میں بھی چائے پینے ایک ہوٹل میں بیٹھ گیا۔ یہاں سے ٹیڈی لڑکی مجھے برابر نظر آ رہی تھی۔

عشق میں مجھے ڈھیٹ بننے کی روایات کا پورا پورا خیال تھا۔ چائے بڑی خراب اور بدذائقہ تھی۔ ایسے لگا جیسے بیری کے پتّے ابال کر پی رہے ہیں۔ بیری کے پتوں سے اچانک مجھے خیال آ گیا کہ مُردے کو جس پانی سے غسل دیتے ہیں۔ اس میں بیری کے پتے ڈالا کرتے ہیں۔ پھر خیال آیا کہ ایک روز میری محبوبہ بھی مر جائے گی اور اس کی مردہ میت لکڑی کے تختے پر پڑی ہو گی۔ اکڑی ہوئی۔ بے حس۔ ٹھنڈی لاش ــــ دونوں کبوتروں کی گردنیں ڈھلک گئی ہوں گی۔ آنکھیں پتھرا گئی ہوں گی۔ اور ایک عورت اس پر پانی کے لوٹے ڈال کر اسے سنلائیٹ صابن سے دھو رہی ہو گی۔ جس طرح حلوائی لکڑی کی مدانی کو دھوتے ہیں۔ مرنے کے بعد حسین ترین عورت اور لکڑی کی مدانی میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

میں نے ایک جھرجھری لی اور اپنے خیالات کا سلسلہ بدل دیا۔ میری ٹیڈی محبوبہ سیب کھا رہی تھی۔ سرخ سیب اس کے ہاتھ میں تھا۔ اور بھرپور دانت مار کر اسے کاٹ کر کھائے جا رہی تھی۔ کھانے میں اس کی ناک اوپر نیچے اٹھ رہی تھی۔ لمبی اٹھی ہوئی رومن ناک

—— کہتے ہیں اگر کلوپیٹرا کی ناک ذرا کم لمبی ہوتی تو آج کی مصر کی تاریخ مختلف ہوتی۔ اگر میری محبوبہ کی ناک بھی ذرا کم لمبی ہوتی تو میں اس پر کبھی عاشق نہ ہوتا۔ اور اپنی کلوپیٹرا کا انطنی بنا کمپنی باغ کے ہوٹل میں بیری کے پتوں کی اُبلی ہوئی چائے نہ پی رہا ہوتا۔

بھوں .... بھواں ... بھوں .... بھواں۔

بس نے مسافروں کو آوازیں دینا شروع کر دیں۔ بس کمپنی باغ کے چشمے کے ٹھنڈے پانی میں نہا دھو کر کپڑے پہن کر لپ سٹک، پاؤڈر وغیرہ لگا کر مری چلنے کو تیار ہو گئی تھی۔ جب تمام مسافر آکر بیٹھ گئے تو ڈرائیور نے انجن سٹارٹ کیا اور پہاڑ کی چڑھائی چڑھنے لگا۔ اب چڑھائی زیادہ دشوار ہو گئی تھی اور موسم بڑا خوشگوار ہو گیا تھا۔ اگست کا مہینہ تھا۔ اس مہینے میں کوہ مری کا موسم بڑا خوشگوار ہوتا ہے۔ بس جب مانسہرہ گلی پہنچی تو بادلوں کی دھند نے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ڈرائیور نے بس کی بتیاں روشن کر دیں۔ دھند سے باہر نکلے تو دیکھا کہ آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے ہیں اور اوپر مری کی پہاڑیوں پر بجلی چمک رہی ہے۔ ایک دو بار بادلوں کی گرج بھی سنائی دی۔

چھانگا موڑ آیا تو اچانک بارش شروع ہو گئی۔ اور سردی بڑھ گئی۔ مسافروں نے کھڑکیاں چڑھا لیں۔ اور سوئیٹر وغیرہ ٹوکریوں میں سے نکال کر پہن لیے۔ ٹیڈی فیملی نے بھی گرم کپڑے نکال کر پہن لیے۔ میری محبوبہ نے شال اوڑھ لی۔ بس سنی بنک ڈاکخانے کے باہر رک گئی۔ مجھے یہیں اترنا تھا۔ میں نے اپنا اٹیچی کیس اٹھایا۔ اور کھڑکی میں سے کود کر باہر گرتی بارش میں سڑک پر آ گیا۔ پھر جلدی سے ڈاکخانے کی برساتی میں کھڑا ہو گیا۔ میں نے اپنی محبوبہ کو دیکھا۔ اس نے بھی

میری طرف دیکھا اور پھر اپنی چھوٹی بہن کو کچھ کہہ کر ہنس دی۔ کوئی بات نہیں۔ کل شام مال پر ملاقات ہو گی۔

الوداع! میری کلوپیٹرا! کل شام مال پر انطنی تم سے ملے گا!

بارش بڑے زوروں پر تھی۔ پہاڑ کی بارش بڑی موسلا دھار ہوتی ہے۔ آدمی دو قدم چلے تو اندر کی بنیان تک شرابور ہو جاتی ہے۔ چنانچہ میں برساتی میں اٹیچی کیس رکھ کر بیٹھ گیا اور سگریٹ سلگا کر بارش رکنے کا انتظار کرنے لگا۔ ایک پہاڑیا میرے پاس آ کر بولا۔

"بابو صاحب قلیٹ چاہیے"

میں نے نفی میں سر ہلایا اور بڑے مزے سے سگریٹ پینے اور بارش کی آواز سننے لگا۔ بارش کی آواز بڑی پرشور تھی۔ سڑک پر پانی کی نہر چل رہی تھی۔ سامنے والے پہاڑ سے آبشاریں گر رہی تھیں۔ اوپر سبز رنگ کا ایک چھوٹا سا کاٹیج تھا۔ جس کی کھڑکیاں بند تھیں اور اندر کی طرف پردے گرے ہوئے تھے۔ ایک نوکر بھاگ کر باہر آیا اور کاؤ کے درخت کے نیچے پڑی ہوئی کرسی اٹھا کر پھر اندر بھاگ گیا۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد بارش رکی۔ میں آدھی ڈبل سگریٹ پھونک چکا تھا۔ بارش تھم گئی۔ سردی بڑھ گئی تھی۔ مجھے سردی لگ رہی تھی۔ میں نے اپنا اٹیچی کیس ایک مزدور کے سر پر رکھا اور پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ میرا سانس پھول گیا اور پسینہ آ گیا۔ کافی اوپر جا کر چیڑھ کے درختوں میں ایک سرخ چھتوں والی کوٹھی نظر آئی۔ مجھے اسی جگہ جانا تھا۔ اس کوٹھی میں میرا ایک پرانا اور جگری دوست اپنی ساری فیملی کے ساتھ ٹھہرا ہوا تھا اور اس نے مجھے بار بار خط لکھ کر یہاں بلایا تھا۔ وہ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی میں ایس۔ ڈی۔ او تھا۔ اور خوب رشوت لیتا تھا۔ بڑا یار باش

آدمی تھا۔ مجھ سے عمر میں کوئی چھ سال بڑا تھا۔ مجھے اچانک کوٹھی کے باہر دیکھ کر بڑا خوش ہوا۔

"ارے۔ تم نے تار بھی نہ دی"

مجھے ایک الگ کمرہ دے دیا گیا جس کے ساتھ ہی علیحدہ باتھ روم تھا۔ پلنگ پر بستر لگا دیا گیا۔ میں نے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے اتنے میں چائے آگئی۔ گرم گرم چائے پر ہم دونوں نے مل کر دنیا جہان کی باتیں کیں اور پھر میں سو گیا۔ کوئی ڈیڑھ گھنٹے بعد اٹھا۔ کھانا کھایا تھوڑی دور پہاڑی پر سیر کی اور واپس آکر بستر پر لحاف لے کر پڑ گیا۔ سفر کا تھکا ہوا تھا اور پھر سردی بھی خوب ہو گئی تھی لیٹتے ہی سو گیا۔

اگلے روز شام کو میں نے نہا دھو کر شیو بنائی۔ نیا سوٹ پہنا۔ اپنے دوست کی ٹائی لگائی اور سنی بنک آ گئے۔ یہاں اس کی جیپ تیار کھڑی تھی۔ ہم جیپ میں سوار ہو کر اوپر مال کی طرف روانہ ہو گئے۔ اس کے بچے اور خاندان بھی مال پر گیا ہوا تھا یہی جیپ ابھی ابھی انہیں اوپر چھوڑ کر آئی تھی۔ ایجنسی پہنچ کر ہم نے جیپ ایک طرف لگا دی اور پیدل چڑھائی چڑھنے لگے۔ مال پر میں نے اسے بتا دیا تھا کہ راستے میں ایک لڑکی پر میں عاشق ہو گیا ہوں اور اب مال روڈ پر اس کی تلاش ہے۔ پرویز یعنی میرا دوست مسکرا دیا۔

"کمینے، عشق بازی نہیں چھوڑتا"

مال پر بڑی رونق تھی۔ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ عورتیں اور لڑکیاں زرق برق ماڈرن ترین لباس میں ملبوس خراماں خراماں شاہزادیوں کی طرح مال پر رواں دواں تھیں۔ ایسے لگ رہا تھا جیسے کسی کی بارات چلی جا رہی ہے۔ لباس جسموں کے ساتھ چپکے ہوئے تھے۔ پانچے

ٹخنوں کے ساتھ لگے تھے۔ سمارٹ اور چست و چالاک حسین لڑکیاں بڑے نازو انداز سے بالوں کو جھٹکتی چل جا رہی تھیں۔ ریشمی ملبوسات سرسرا رہے تھے۔ خوشبوئیں اڑ رہی تھیں۔ پاؤڈر میں لپے ہوئے روغنی چہرے چمک رہے تھے۔ آنکھیں اشارے کر رہی تھیں اور بھنویں پھڑک رہی تھیں۔ ہونٹ مسکرا رہے تھے۔ دانتوں کے موتی چمک رہے تھے۔ رنگ و نور و خوشبو کا ایک سیلاب اوپر سے نیچے، نیچے سے اوپر بہہ رہا تھا۔ سیمنز ہوٹل کی بالکونی بھری ہوئی تھی۔ اندر سے موسیقی کی ہلکی ہلکی لہریں باہر آ رہی تھیں۔ لینٹوٹ میں بھی تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ میری نگاہیں اپنی محبوبہ کو تلاش کر رہی تھیں۔ لیکن وہ کہیں دکھائی نہ دے رہی تھی۔ مال کے دو تین چکر لگانے کے بعد ہم نا امید ہو کر سیمنز میں آ کر بیٹھ گئے۔ پرویز نے کہا۔

"تم اس کا چہرہ تو نہیں بھول گئے"

میں نے کہا۔

اس کا چہرہ میں مرنے کے بعد بھی یاد رکھوں گا۔ کلوپیٹرا کا چہرہ انطنی کبھی نہیں بھلا سکتا"

اتنے میں میرے دوست کا خاندان یعنی پورے کا پورا کنبہ بھی وہاں آ گیا اور ہم سب مل کر چائے پینے لگے۔ اب ان کے گھر میں سے کوئی بھی پردہ وغیرہ نہ کرتا تھا۔ میں کوئی چار سال بعد ان لوگوں سے مل رہا تھا۔ پروین یعنی پرویز کی چھوٹی بہن کو میں نہ پہچان سکا۔ چار سالوں میں وہ ایکدم بدل گئی تھی۔ پہلے والی دبلی پتلی پروین کی جگہ اب صحت مند اور زندگی سے بھرپور پروین میرے سامنے بیٹھی مسکرا مسکرا کر شرما شرما کر باتیں کر رہی تھی۔



پروین نے بھی مجھے کچھ عجیب سی نظروں سے دیکھا۔
شاید مجھ میں بھی چار سالوں میں کچھ تبدیلی آگئی تھی۔ پروین کی آنکھیں غلافی ہوگئی تھیں جسم بھر
گیا تھا۔ گالوں پر شفق کی سرخیاں جھلکنے لگی تھیں۔ جب ہم چلنے کے لئے اٹھے تو وہ میری طرف
دیکھ کر آہستہ سے مسکرا دی۔ میں اپنے دوست سے باتیں کرنے لگا۔ دل میں ایک عجیب
طرح کی گدگدی سی محسوس ہوئی میں پروین کو کبھی ان نگاہوں سے دیکھنا نہ چاہتا تھا۔ جن نگاہوں
سے وہ مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں اسے دیکھ سکتا تھا لیکن دیکھنا نہ چاہتا تھا کیونکہ وہ میرے
دوست کی بہن تھی۔ لیکن آج کل چونکہ دوسری قدروں کی مانند یہ اخلاقی قدر بھی بدل گئی
ہے اس لئے میں نے کچھ زیادہ خیال نہ کیا اور پروین کو پوری اجازت دے دی کہ وہ
مجھے جن نظروں سے چاہے دیکھتی رہے۔ افسوس کہ اس روز میں اپنی بڈھی محبوبہ کو
نہ دیکھ سکا۔ دوسرے روز شام کو ہم پھر مال پر سیر کرنے آ گئے۔ آدمی کو مری جائے تو
اسے ہر روز شام کو مال پر آنا پڑتا ہے ورنہ مری آنے کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ دل

میں یہ امید لیے کہ شاید اپنی محبوبہ سے ملاقات ہو جائے۔ میں پرویز کے ساتھ مال کے چکر لگانے لگا۔ اچانک سیروز سینما کے پاس میں نے اُسے دیکھ لیا۔ وہ اپنی چھوٹی بہن کے ساتھ اوپر سے نیچے اتر رہی تھی۔ وہ گلابی رنگ کے انتہائی چست لباس میں ملبوس تھی یعنہ بالھر گو نکلا ہوا تھا اور سر پر بالوں کا گچھا بنا ہوا تھا۔ میں نے کہا۔

"ادھر دیکھ پرویز! وہ آ رہی ہے"

پرویز نے بھی اسے دیکھا اور میرے انتخاب کی داد دی کیونکہ واقعی بڑی حسین لگ رہی تھی۔ اس کی چال میں کلوپیٹرا ایسا شاہانہ انداز تھا۔ معلوم ہو رہا تھا کہ ملکۂ مصر اپنے غلاموں کے جلوس میں دریائے نیل کی سیر کو نکلی ہے۔ اس وقت مجھے سوائے میرے مال پر سب لوگ اس کے غلام نظر آئے کیونکہ میں تو اس کا مارک انٹنی تھا۔

اب میں نے اس کا تعاقب شروع کر دیا۔ پرویز بھی میرے ساتھ رہا۔ وہ جس دکان میں داخل ہوتیں ہم بھی ساتھ داخل ہوتے۔ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا۔ اور اپنی بہن کے کان میں کھسر پھسر کر کے اسے بھی بتا دیا تھا۔ دونوں باخبر ہو کر چل رہی تھیں۔ کوئی گھنٹہ یہ تعاقب جاری رہا پھر پرویز کے کنبہ والے مل گئے۔ یہ لوگ سیمز میں جا کر بیٹھ گئے اور میں اپنی محبوبہ کا اکیلا ہی تعاقب کرتا رہا۔ آخر وہ دونوں لنٹاٹ میں آ کر بیٹھ گئیں۔ میں بھی وہاں جا کر ان کے ساتھ والی میز پر بیٹھ گیا اور چائے کا آرڈر دے دیا۔ وہ دونوں بھی چائے منگوا کر پینے لگیں۔ وہ پیسٹری بھی کھا رہی تھیں اور میری طرف دیکھ کر ایک دوسری سے ہنس ہنس کر باتیں بھی کر رہی تھیں۔ میں بھی ان کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا اور سگریٹ

پی رہا تھا۔ میں نے اندر جا کر ان کے بیرے سے کہا کہ وہ بل کا آرڈر میری طرف سے لائے
جب انہوں نے بل کا آرڈر دیا تو بیرے نے مسکرا کر میری طرف اشارہ کیا۔

"صاحب نے بل ادا کر دیا ہے"

پہلے تو انہوں نے حیرانی سے مجھے دیکھا اور پھر ایک دوسری کی طرف دیکھ کر ہنس
پڑیں۔ اٹھ کر باہر نکل گئیں۔ میں بھی ان کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ اب یہ ہوتا کہ کبھی میں ان کے ساتھ
آجاتا اور کبھی وہ رک کر پیچھے ہو جاتیں اور کبھی ہم دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگتے۔ اسی طرح
ہم ہنڈی پوائنٹ کی طرف آ گئے۔ یہاں وہ ایک دکان میں داخل ہو گئیں۔ میں کانپ
گیا کیونکہ یہ دکان بناؤ سنگار کے سامان کی تھی۔ اگر انہوں نے یہاں خرید و فروخت شروع کر
دی تو میرا دیوالیہ نکل جائے گا۔ انہوں نے دو لپ سٹک اور ایک میکس فیکٹر کا بڑا ڈبہ پسند
کیا۔ میں نے فوراً دس دس کے دو نوٹ نکال کر جو میں نے اپنے دوست سے ادھار
لیے تھے۔ دکان دار کو پیش کر دیئے۔ لڑکیوں نے کوئی اعتراض نہ کیا اور چیزوں کا لفافہ تھام
کر چپکے سے باہر آ گئیں۔ دکاندار نے میری طرف مشتبہ نظروں سے دیکھا اور مسکرا کر بل کاٹ دیا۔
اب میں پھر ان کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ میرے کوئی تیس روپے خرچ ہو گئے تھے۔ دس
میرے اور بیس ادھار کے ـــــ میرا تو دیوالیہ نکلنے والا تھا۔ اب میں انہیں ہاتھ سے
کھو دینا گوارا ہی نہیں کر سکتا تھا۔ چنانچہ پہلے سے زیادہ اعتماد اور تندہی سے ان کا تعاقب شروع
کر دیا

وہ اب واپس گھر جا رہی تھیں۔ کشمیر پوائنٹ کی جانب ـــــ! اوپر جا کر بہتر کم

ہوئی تو میں ان کے بالکل پاس آ کر چلنے لگا۔ میں نے آہستہ سے مسکرا کر کہا۔

"آج موسم بڑا خوشگوار ہے"

انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ ایک دوسری کی طرف دیکھ کر ہنس پڑیں۔ میں بھی ہنس پڑا۔ اور کیا کرتا۔ وہی ڈھیٹ پنے کا نظریہ یہاں بھی کام آیا۔ پھر میں نے نیا سگریٹ سلگا کر کہا۔

"کیا کل بھی ملاقات ہو سکے گی؟"

انہوں نے پھر کوئی جواب نہ دیا۔ اور ہنس دیں۔ میں بھی ہنس دیا۔ اس دنیا میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہنسنے والوں کا ہنس کر ساتھ دینا ہی پڑتا ہے ٹیلی فون والوں کے دفتر کے قریب آ کر وہ ایک طرف کو گھوم گئیں۔ میں بھی ادھر کو ہی گھوم گیا۔ اس پر بیٹھی ہوئی ناک والی نے میری طرف دیکھ کر کہا

"اب ہمارا کالج آ گیا ہے۔ آپ تشریف لے جا سکتے ہیں"

میں نے جلدی سے کہا۔

"کہاں؟ کالج میں؟"

اٹھی ہوئی ناک والی یعنی میری محبوبہ ہنس پڑی اور بولی۔

"جی نہیں، واپس"

کیا کل ملاقات ہوگی؟

"جی نہیں"

اور وہ ہنستی ہوئی سامنے والی کاٹیج کی طرف بھاگ گئیں۔ میں شرمندہ سا ہو کر وہاں اکیلا کھڑا رہا
لیکن میں عشق میں ڈھیٹ ہوں۔ کافی ڈھیٹ ہوں۔ مجھے ذرا سا بھی پسینہ نہ آیا۔ میں
نے سگریٹ ایک طرف پھینکا اور واپس چل پڑا۔ ایک پل کے لئے محسوس ہوا کہ تیس
روپیوں کا بیڑا غرق ہو گیا۔ پھر خیال آیا کہ کل دیکھا جائے گا

اگلے روز میں شام کو مال روڈ پر گیا دیکھتا ہوں کہ سیمنز کے ایک ٹیبل پر وہ ہمٹی ہوئی ناک
والی چھوٹی بہن انتہائی چست اور ریشمی کپڑوں میں ملبوس خوب پینٹ کئے اکیلی بیٹھی کافی پی
رہی ہے۔ مجھے اس کی بیٹھی ہوئی ناک سے نفرت تھی مگر کیا کرتا میری محبوبہ کی چھوٹی بہن
تھی۔ اسکی وساطت اور اس کی خوشبودں سے کئی مراحل طے ہو سکتے تھے۔ میں بے جھجکے
سے جا کر اس کی میز پر آرام سے بیٹھ گیا۔

"ہیلو، کیا حال ہے؟"

"ہیلو!"

اس نے صرف اتنا کہا اور باہر دیکھنے لگی۔

"کیا کسی کا انتظار ہے"

"زری آنے والی تھی۔ ابھی تک نہیں آئی"

"زری یعنی تمہاری.........." میں نے بات بیچ ہی میں چھوڑ دی۔

"ہاں، میری بڑی بہن جو کل میرے ساتھ تھی"

"خوب! اور کافی منگواؤں۔

"منگوالیں"

میں نے مزید کافی منگوائی۔ بیٹھی ہوئی ناک والی نے پیسٹریاں بھی منگوالیں۔ اب میں نے ایک پیسٹری اٹھائی تو اس نے چار پیسٹریوں کا دیکھتے دیکھتے صفایا کر دیا۔ میں صرف اپنے دوست سے دس روپے قرض لے کر نکلا تھا۔ میرا رنگ پیسٹری کی لسنتی کریم سے بھی زیادہ زرد پڑ گیا۔ میں دل میں حساب لگانے لگا۔ چار پیسٹریاں ایک روپیہ آٹھ آنے، ایک میری پیسٹری کل ہوئے ایک روپیہ چودہ آنے اور کافی کے تین روپے —— کوئی پرواہ نہیں۔ لیکن جب زری آگئی تو کہیں پیسے ختم نہ ہو جائیں۔

میں سیلز میں ادھر ادھر اپنے واقف کاروں کو تلاش کرنے لگا۔ ہم کوئی آدھ گھنٹے وہاں بیٹھے۔ لیکن میری محبوبہ زری نہ آئی۔ ہم دونوں اٹھ کر نیچے آگئے وہ بولی۔

"ہنڈی پوائنٹ کی طرف چلتے ہیں۔ مجھے کچھ خریدنا ہے"

میں کانپ گیا۔ یا اللہ خیر! اب کیا ہوگا۔ یہ گھوڑی تو اپنا پورا ساز خرید رہی ہے۔ میرے میرے پاس صرف پانچ روپے باقی رہ گئے تھے۔ وہ ایک کپڑے کی دکان میں آگئی۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ یہاں ہلکی سے ہلکی خریداری بھی چالیس پچاس سے کم نہ ہوگی۔ اس نے دکاندار سے کہا۔

"وہ پیس آیا یا نہیں؟"

"جی نہیں۔ ابھی نہیں آیا۔ کل تک آجائے گا"

"تو پھر میں کل آؤں گی"

میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور اس کے ساتھ باہر آ گیا۔ اب وہ میرے بالکل ساتھ لگی چل رہی تھی۔ اور وہ ایک بار اس کا بدن میرے بدن سے چھو گیا تھا۔ لیکن میں تو زری کے جسم کا عاشق تھا۔ اس بھینی گھوڑی سے مجھے کچھ کام نہ تھا۔ میں نے ادھر ادھر کی باتیں شروع کر دیں اور اس کی بڑی بہن زری کی تعریف کرنے لگا۔ تو اس نے تیوری چڑھا کر مجھے دیکھا۔

"معلوم ہوتا ہے آپ زری کو بہت پسند کرتے ہیں"

میں نے جلدی سے کہا۔

"نہیں جنیں ایسی کوئی بات نہیں۔ میں تو تمہیں اس سے زیادہ پسند کرتا ہوں"

"سچ"

اس نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور اطمینان سے چلنے لگی۔ ایک ویران سی جگہ پہنچ کر ہم بیٹھ گئے۔ اس نے گہرا سانس لیا تو اس کے چوڑے نتھنے اور چوڑے ہو گئے۔ اب وہ مجھ سے محبت کا اظہار کرنے لگی۔ میں پریشان ہو گیا۔ میں اس بات پر بالکل تیار نہ تھا۔ لیکن وہ برابر محبت کا اظہار کئے جا رہی تھی اور اس نے زبردستی میری انگلی میں سے انگوٹھی اتار کر بطور نشانی اپنی انگلی میں ڈال لی۔

"کتنی پیاری انگوٹھی ہے میں اسے ہمیشہ اپنے پاس رکھوں گی"

دراصل یہ انگوٹھی لاہور میں ایک لڑکی کی انگلی سے میں نے بھی اسی طرح زبردستی اتار کر اپنی انگلی میں پہن لی تھی۔ یہ سونے کی انگوٹھی تھی اور میرا خیال تھا کہ مری میں بالکل ہی پیسے ختم ہو جائیں گے تو اسے فروخت کر دوں گا۔ مگر اس ظالم بھینی ہوئی ناک والی نے اتنی مہلت بھی

نہ دی۔ اب میں اس سے واپس لے نہ سکتا تھا۔ مجبوراً زہر کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ وہ اگلے روز ملنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔

میں زری سے ملنے کی حسرت لے کر گھر آگیا۔ اب میں اس خیال سے زیادہ پریشان تھا کہ جس لڑکی کو میں نے اپنی محبت کے حصول کا ذریعہ بنانا چاہا تھا وہ میرے راستے کا پتھر بن گئی ہے مگر اب کچھ نہ کر سکتا تھا۔ رات ہو گئی تھی۔ کوٹھی میں سوائے پروین اور نوکرانی کے اور کوئی نہیں تھا۔ میں بستر پر لیٹا کتاب کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

"آجاؤ"

پروین اندر آگئی اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"کھانا آپ ابھی کھائیں گے یا بھائی جان کے آنے پر"

میں نے کتاب میز پر رکھ دی اور کہا۔

"انہیں آ لینے دو"

"بہت اچھا"

پروین واپس جانے لگی پھر اچانک رک کر بولی۔

"یہ آپ کونسی کتاب پڑھ رہے ہیں"

میں نے کتاب اس کی طرف بڑھا دی۔ اس نے کتاب کو کھول کر دیکھا اور مسکرا دی

"آپ کو شعر و شاعری سے بڑی دلچسپی ہے کیا؟"

"کیوں نہیں، شعر بڑی دلچسپی کی شے ہوتے ہیں"

تب مجھے بھی شاعری سے بڑا لگاؤ ہے بلکہ آپ کو یہ سُن کر ہنسی آئے گی کہ میں کبھی کبھار اُوٹ پٹانگ شعر کہہ بھی لیا کرتی ہوں"

"اچھا! یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے"

"کسی روز میں آپ کو اپنے شعر سناؤں گی"

"ضرور ضرور، میں بڑے شوق سے سنوں گا"

"اچھا اب میں جاتی ہوں"

پروین نے عجیب نگاہوں سے مجھے دیکھا اور ذرا سا مسکرا کر باہر نکل گئی۔ میں کتاب کھول کر پھر بستر پر پڑ گیا۔ اب میں کچھ بے اطمینانی سی محسوس کر رہا تھا۔ نظریں کتاب کے صفحات سے اچٹ اچٹ جاتی تھیں۔

ساڑھے نو بجے رات پرویز بھی آ گیا۔ کھانا سارے کنبے نے مل کر کھایا۔ بڑے کمرے کے بڑے میز کے گرد سب لوگ بیٹھے تھے۔ پرویز فلم کی کہانی پر بحث کرتا رہا۔ اس دوران میں پروین چوری چوری میری طرف دیکھتی رہی اور دو ایک بار مسکرا بھی دی۔ لیکن میں نے اسے بالکل شہ نہ دی۔ کھانا کھا کر چپکے سے اپنے کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گیا۔ اچانک باہر بادل چھا گئے اور بجلی چمکی اور ٹین کی ڈھلانی چھت پر بارش کی ٹپ ٹپا ٹپ شروع ہو گئی۔ مجھے ایک جھرجھری سی آئی۔ سردی زیادہ ہو گئی۔ میں نے چاروں طرف سے لحاف اوپر کیا اور ٹیبل لیمپ بجھا کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ میرا خیال ہے کہ میں کوئی دو اڑھائی گھنٹے تک پڑھتا رہا تھا اور اس وقت رات نصف سے زیادہ گزر چکی تھی۔ بارش کا شور زیادہ ہو گیا تھا اور سوائے بارش کی آواز کے

اور کچھ سنائی نہ دے رہا تھا۔ اچانک مجھے یوں لگا جیسے کسی نے اندھیرے میں دروازہ کھول کر دوبارہ بند کیا ہے اور دبے پاؤں میری طرف بڑھ رہا ہے۔ میں کانپ سا گیا۔ مجھے جن اور چڑیلیں یاد آنے لگیں۔

۳

کمرے میں مکمل تاریکی تھی۔ میں نے پوری آنکھیں کھول کر دیکھا۔ مجھے کچھ دکھائی نہ دیا۔ اگر کھڑکیوں پر پردے نہ گرے ہوتے تو اسقدر اندھیرا نہ ہوتا۔ کیونکہ رات کتنی ہی تاریک کیوں نہ ہو اس کی ہلکی ہلکی، دھیمی سی روشنی ضرور ہوا کرتی ہے۔ میرا دل چاہا کہ اُٹھ کر پردے کھینچ دوں۔ ٹیبل لیمپ مجھ سے فاصلے پر اوپر سنگار میز پر رکھا تھا۔ اچانک مجھے اپنے اوپر کسی کے سانس لینے کی آواز سنائی دی۔ اس سے پیشتر کہ میں لحاف پرے پھینک کر اُٹھ بیٹھوں۔ کسی کا نرم اور گداز ہاتھ میری پیشانی سے لگ گیا۔

اس پہاڑ کی طوفانی اور بارش بھری رات میں مجھ سے کون ملنے آیا ہے۔ میں ایک پل کے لیئے بالکل ساکت ہو گیا۔ میں نے کوئی حرکت نہ کی۔ نرم اور گداز نسوانی ہاتھ بھی پتھر کی طرح میری پیشانی پر پڑا رہا۔ پھر اس ہاتھ میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ میرے رخساروں پر پھرنے لگا۔ اور پھر کسی کے گہرا اور سرد سانس لینے کی سرگوشی سنائی دی۔ میں نے اس ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور بستر پہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بارش کی آواز مدھم ہو گئی تھی۔ میں نے کہا۔

"پروین"

ہاتھ ایک دم پیچھے ہٹ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی اٹھ کر واپس جانے لگا ہے۔

میں نے جلدی سے ٹیبل لیمپ جلا دیا۔ کمرہ روشنی سے بھر گیا اور اس روشنی میں میں نے دیکھا کہ پرویز کی سب سے بڑی بہن جو بیوہ تھی اور سات بچوں کی ماں تھی۔ میرے سامنے سے اٹھ کر چہرہ ہاتھوں میں چھپائے دروازے کی طرف بھاگی اور باہر نکل گئی۔ میں حیران اور پشیمان سا اکیلا بیٹھا رہا۔ اس بیوہ عورت کا نام زینت تھا۔ عمر چالیس کے قریب تھی۔ خاوند کو مرے چھ سال ہو گئے تھے۔ پرویز کے پاس بچوں کو لے کر گرمیاں بسر کرنے آئی تھی۔ کبھی اس نے میری طرف عاشقانہ نظروں سے نہ دیکھا تھا۔ میں نے ہمیشہ اس کا احترام کیا تھا جیسا کہ میں اپنے دوست پرویز کے کنبے کے ہر فرد کا احترام کرتا تھا۔ اب مجھے سب سے زیادہ ندامت اس بات کی تھی کہ میرے منہ سے پروین کا نام سن کر یہ عورت کیا سوچ رہی ہوگی۔ وہ یقیناً یہ خیال کرے گی کہ میں پروین سے محبت کرتا ہوں۔ ہم دونوں راتوں کو چھپ چھپ کر ملتے ہیں۔ ہمارا ایک دوسرے سے پیار ہے۔ حالانکہ اس میں ذرہ برابر بھی حقیقت نہ تھی۔ میں پروین کا ہاتھ تھام کر بستر پر اس لئے بیٹھ گیا تھا کہ اسے سمجھانا چاہتا تھا کہ وہ غلط کام کر رہی ہے۔ اسے اپنے جذبات کو اپنے قابو میں رکھنا چاہیے کیونکہ وہ میرے عزیز دوست کی بہن ہے۔ اور میں اسے بڑی ہی عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہوں۔

لیکن اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اب زینت کے دل میں پیدا ہو چکے خیال کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں نکال سکتی تھی۔ اسے مجھ سے دوہرا غصہ ہوگا۔ ایک تو یہ

کہ میں اس کی بجائے پروین سے محبت کرتا ہوں اور دوسرا یہ کہ میں اس کی چھوٹی بہن کو خراب کر رہا ہوں۔ بہرحال اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے ٹیبل لیمپ بجھا دیا اور لحاف میں دبک کر سونے کی کوشش کرنے لگا۔ بارش ہلکی ہلکی رفتار سے مسلسل برس رہی تھی۔ کتنی ہی دیر تک میں بستر پر کروٹیں بدلتا رہا۔ جانے کس وقت مجھے نیند آئی اور سو گیا۔

صبح ناشتہ میں نے کمرے ہی میں کیا۔

ناشتہ کر کے میں بستر میں لیٹ گیا اور ڈی ایچ لارنس کو پڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر کے لئے پرویز میرے کمرے میں آ گیا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ اور بارش مسلسل ہو رہی تھی۔ میں نے کھڑکی کھول دی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کمرے میں آ رہی تھی۔ میں اور پرویز بیٹھے سگریٹ پیتے اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پرویز نے کہا۔

"خدا کے لئے ایسا نہ کہو۔ بارش رک جائے گی اور مال پر زندگی ضرور آئے گی۔"

"مطلب یہ کہ سونے کی مجبوری۔"

"میرا خیال ہے یہ لفظ زراعت سے نکلا ہے۔"

اس پر ہم دونوں ہنس پڑے۔ نوکر کافی لے آیا۔ ہم کافی پیتے رہے اور دلچسپ باتیں بھی کرتے رہے۔ اس کے بعد پرویز چلا گیا۔ اور میں بستر میں لیٹ کر ناول پڑھنے لگا۔ مری آ کر آدمی کو سوائے کھانے، لیٹنے اور سیر کرنے کے اور کوئی کام نہیں ہوتا۔ سیر کرے، کھانا کھائے، پڑھے اور سو جائے۔ اٹھ کر پھر سیر کرے۔ پھر کھانا کھائے اور پھر سو جائے۔ پہاڑوں پر زندگی صرف ایک ہی چکر میں چلتی ہے۔ اور جب آدمی ایک بار اس چکر

میں پھنس جائے تو پھر وہ مشکل ہی سے نکلتا ہے۔ دوپہر کو کھانا سب نے مل کر بڑے کمرے میں کھایا۔ پروین تو خیر مجھے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھا ہی کرتی تھی۔ لیکن آج زینت کی نگاہوں میں مجھے عجیب قسم کی نفرت اور زہر سا معلوم ہوتا تھا۔ ایک دو بار اس نے بڑی گہری اور خاموش نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ یہ نظریں مجھے نشتر کی طرح اپنے دل میں اترتی ہوئی محسوس ہوئیں اور میرے جسم میں سنسنی دوڑ گئی

دوپہر کے بعد پرویز نے اچانک نتھیا گلی جانے کا پروگرام بنا دیا۔ موسم اچھا ہو گیا تھا۔ بادل چھٹ گئے تھے اور دھوپ نکل آئی تھی۔ میں نے نتھیا گلی جانے سے معذوری ظاہر کر دی کیونکہ مجھے شام کو مال پر زری سے ملنے کی امید تھی۔ چنانچہ پرویز سارے کنبے کو جیپ میں بٹھلا کر نتھیا گلی کی طرف روانہ ہو گیا۔ شام کو میں نے شیو بنائی۔ منہ، ہاتھ دھویا، نئے کپڑے پہنے اور بس میں سوار ہو کر مال پر آ گیا۔ موسم بڑا خوشگوار ہو گیا تھا۔ مال پر برقی قمقمے روشن تھے۔ ساری مال روشنیوں میں نہائی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ہر طرف عورتوں اور مردوں کا ہجوم تھا۔ حسب معمول ہوٹل بھرے ہوئے تھے۔ سیسل میں موسیقی شروع تھی۔ چست لباس والی ٹیڈی لڑکیوں کی ٹولیاں مال پر ادھر سے ادھر گشت لگا رہی تھیں۔ چکر پر چکر کاٹ رہی تھیں مگر دل پھر بھی نہیں بھر رہا تھا۔ بس وہ مری کے چکر میں پھنس گئی تھیں اور اب اس سے نجات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں سگریٹ منہ میں دبائے مال پر لوگوں کے ہجوم میں گھسا جا رہا تھا۔ ہر طرف خوشبوئیں ہی خوشبوئیں اڑ رہی تھیں۔ چمک دار آنکھیں۔ روغنی ہونٹ۔ سرخ رنگے ہوئے رخسار۔ زرق برق کپڑے، بالوں کے گھونسلے، شانوں پر بکھری ہوئی زلفیں۔ مسکراتے

ہونٹ، چمکیلے دانت، مردوں کی ویران متلاشی آنکھیں، بھوکی نگاہیں، گرسنہ انداز —— مال روڈ کے دو تین چکر لگانے کے بعد جب مجھے اپنی ٹیڈی محبوبہ زری کہیں بھی دکھائی نہ دی۔ تو میں نا امید ہو کر ڈاک خانے کی عقبی سڑک پر نکل گیا۔ تھوڑی دُور آگے جاکر کیا دیکھتا ہوں کہ زری اپنی ماں اور خالاؤں اور چھوٹی بہن کے ساتھ سیر کرتی چلی جارہی ہے۔

میں بہت خوش ہوا۔ میری تلاش بے سود نہیں گئی تھی۔ خوبصورت ٹیڈی حسینہ کا سراغ مل گیا تھا۔ میں اب نیز تیز چلنے لگا اور اسی طرح چلتا ہوا ایک بار زری کی پارٹی سے آگے نکل گیا۔ ان لوگوں نے یقیناً مجھے دیکھ لیا تھا۔ زری اور اس کی چھوٹی بہن نے تو فوراً پہچان لیا ہو گا۔ میں کچھ دور آگے نکل جانے کے بعد ایک پُل کے جنگلے کے سہارے بیٹھ گیا۔ اور سگریٹ پینے لگا۔ کوئی دس منٹ بعد یہ ٹولی میرے قریب سے گذری۔ زری اور اس کی بہن نے میری طرف دیکھا۔ اور دونوں مسکرائیں۔ زری کی چھوٹی بہن کی مسکراہٹ زیادہ معنی خیز تھی۔ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ میں محض اُسی کی خاطر گھر سے باہر نکلا ہوں اور اس جنگلے پر بیٹھا اُسکی راہ دیکھ رہا ہوں۔ اس کی انگلی میں میری زبردستی اتاری ہوئی انگوٹھی کا نگینہ چمک رہا تھا۔ اور میری بے بسی پر مسکرا رہا تھا۔

ٹولی آگے نکل گئی۔ اب میں نے بڑے اطمینان سے تھوڑا سا فاصلہ ڈال کر اُن لوگوں کے عقب میں چلنا شروع کر دیا۔ کچھ دُور چل کر وہ واپس ہوئے۔ میں ایک بار پھر اُن کے عقب میں آ گیا۔ زری نے دو ایک بار پیچھے مڑ کر مجھے دیکھا اور ہولے سے مسکرا دی۔ میں نے تعاقب جاری رکھا۔ عشق میں صرف ڈھیٹ لوگ ہی کامیاب ہوتے ہیں۔

چنانچہ میں کامیاب ہوگیا۔ میری جد و جہد کی ٹہنی پر سے کامیابی کا پہلا پھول میری جھولی میں آن گرا۔ زری نے اپنے پرس میں سے ایک چھوٹا سا کاغذ کا ٹکڑا نکالا۔ مجھے دکھایا۔ کچھ دیر ہاتھ میں رکھا اور پھر نیچے پھینک دیا۔ جب میں چلتے چلتے اس ٹکڑے کے پاس پہنچا تو میں نے جلدی سے اٹھا کر جیب میں رکھ لیا۔ اب ڈاکخانہ آگیا تھا۔ زری کی ٹولی اوپر کشمیر پوائنٹ کی طرف مڑ گئی اور میں سیمز میں آگیا۔ یہاں آکر میں ایک میز پر بیٹھ گیا۔ کافی کا آرڈر دیا اور تہہ کیا ہوا کاغذ نکال کر پڑھنے لگا۔ انگریزی میں زری نے لکھا تھا۔

"—— کل شام ساڑھے سات بجے پنڈی پوائنٹ پر کراچی سویٹ مارٹ کے پاس تمہیں ملوں گی"

زری"

میں خوشی سے ناچ اٹھا۔ میں اپنی جد و جہد میں کامیاب ہوگیا تھا۔ کل شام زری مجھے مل رہی تھی۔ مجھے اور کیا چاہیے تھا۔ میں نے بڑے سکون کے ساتھ کافی پی۔ کوئی آدھ گھنٹہ وہاں بیٹھا سگریٹ پیتا رہا اور نیچے مال پر حسین عورتوں کو دیکھتا رہا۔ پھر اٹھا اور گھر آگیا۔

گھر آکر میں نے پرویز کو خط دکھایا۔ پرویز بھی خوش ہوگیا کہ میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوگیا تھا۔ اب میں بے تابی سے دوسری شام کا انتظار کرنے لگا۔ دل میں خدا سے صرف ایک ہی دعا مانگ رہا تھا کہ کہیں کل شام بارش نہ شروع ہو جائے۔ کیونکہ بارش میں اس قسم کے عشق میں اس قسم کی لڑکی کا گھر سے عاشق کو ملنے نکلنا ناممکن تھا۔ یہ گجرات کی سوہنی نہیں تھی کہ طوفان میں بھی اپنے مہینوال کو ملنے کچے گھڑے پر دریا میں چل نکلے۔ یہ بناوٹی جنونوں اور ٹیڑی دو دوسری

سے بنائے ہوئے گھونسلے نما بالوں والی ٹیڈی لڑکی تھی۔ بارش میں اس کے میک اپ کے اتر جانے کا ڈر تھا۔ رات کا کھانا کھا کر میں اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ اور لارنس کا ناول پڑھنے لگا۔ کوئی گھنٹہ بھر کی ورق گردانی کے بعد مجھے نیند آنے لگی۔ میں نے بتی بجھائی اور سو گیا۔ کھڑکی کھلی تھی۔ باہر نکھرے ہوئے گہرے نیلے آسمان پر ستارے خوشنما پھولوں کی طرح چمک رہے تھے۔ موسم بڑا ہی خوشگوار تھا۔ سردی زیادہ نہیں تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔ مجھے نیند آ گئی اور میں سو گیا

جانے رات کا کیا بجا تھا کہ اچانک کمرے میں آہٹ ہوئی اور میری آنکھ کھل گئی۔ آہٹ کیا تھی؟ یہ مجھے معلوم نہ ہو سکا۔ کھلی کھڑکی میں سے بہت ہی مدھم روشنی اندر آ رہی تھی۔ اور کمرے کی ہر شے تاریکی میں بہت معمولی طور پر نظر آ رہی تھی۔ میں نے کمرے میں آنکھیں کھول کر غور سے دیکھا نیند بھری آنکھیں صرف ایک انسانی ہیولے کو ہی دیکھ سکیں۔ جو میرے پاس کھڑا تھا۔ میرا جسم سرد پڑ گیا۔ میں خوف سے کانپنے لگا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ یہ کوئی جن ہے اور میری جان قبض کرنے آیا ہے اچانک کسی نے میرے ماتھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ ساتھ ہی مجھے خیال آیا کہ یہ تو زینت ہے۔ آہ! بے چاری بیوہ عورت اس کی حالت کس قدر قابلِ رحم ہے۔ کاش اس کی دوسری شادی کر دی جاتی۔ شاید پھر اس پر یہ حالت کبھی بھی طاری نہ ہوتی۔ میں نے دل میں فیصلہ کر لیا کہ آج اسے اچھی طرح سمجھاؤں گا۔ میں نے اندھیرے میں ہی اسے ہاتھ سے پکڑ کر اپنے پاس بستر پر بٹھا لیا۔ اس کا چہرہ دوسری طرف تھا۔ میں نے کہا۔

"دیکھو زینت بی بی! میں تمہارے بھلے کی بات کہہ رہا ہوں۔"

پیشتر اس کے کہ میں کوئی اور بات کہتا۔ انسانی ہیولے میں حرکت پیدا ہوئی۔ اس نے

پلٹ کر میری طرف دیکھا اور کہا۔

"زینت ! تو کیا آپ .... ؟

یہ پروین کی آواز تھی اور میرے سامنے پروین بیٹھی مجھے حسرت بھری نظروں سے اندھیرے میں تک رہی تھی۔ میں بھی حیران ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ اس گھر میں کیا ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے ؟۔ جب میں پروین سمجھ کر بلاتا ہوں تو زینت نمودار ہو جاتی ہے اور جب زینت سمجھ کر آواز دیتا ہوں تو پروین نکل آتی ہے۔ میں نے پروین کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ اور سر جھکا کر پرے سرک گیا۔

"کاش ! مجھے پہلے اس کی خبر ہوتی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ آپ میری بڑی بہن زینت کو پیار کرتے ہیں"

پروین کی آواز میں حسرت اور غم تھا۔ میں عجیب پریشانی میں مبتلا تھا۔ میں ان میں سے کسی سے بھی محبت نہ کرتا تھا۔ محبت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ وہ دونوں میرے دوست کی بہنیں تھیں اور میں ان دونوں کی عزت کرتا تھا۔ میں نے انہیں کبھی محبوبہ نہ سمجھا تھا۔

میں نے آہستہ سے کہا۔

"اگر زینت نہیں تو تم ہی سہی پروین! میرا کام تمہیں ایک بہت بڑی حقیقت سے آگاہ کرنا ہے اور وہ یہ ہے کہ میں تم دونوں کا احترام کرتا ہوں۔ پچھلی رات تمہاری بڑی بہن زینت میرے پاس آئی تھی۔ اور میں نے اسے بھی یہی کہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ آج بھی وہی ہو گی"

پروین نے سر جھکا رکھا تھا۔ آہستہ سے بولی۔

"احترام سے آپ کا کیا مطلب ہے ؟"

میں نے کہا۔

"تم میرے دوست کی بہن ہو اور میں تمہیں کبھی بری نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا۔"

"تو کیا آپ دوست کی بہنوں کے علاوہ ہر عورت کو بری نگاہ سے دیکھتے ہیں؟"

"نہیں ایسا ہرگز نہیں۔"

"آپ کی باتوں سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے۔"

"تم نے میری بات کو غلط سمجھا ہے۔ میرا مطلب یہ تھا کہ میں اپنے دوست کی بہن کی محبت کا جواب محبت سے نہیں دے سکتا۔"

"یہ اچھا آپ دوستی کا حق سمجھاتے ہیں کہ دوست کی بہن کی محبت کا جواب نفرت سے دے رہے ہیں۔"

"کیا تم مجھ سے بحث کرنے آئی ہو پروین؟"

"بحث تو آپ کر رہے ہیں۔"

"میں تمہیں اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ تمہارا اس طرح آدھی رات کو میرے کمرے میں آنا مناسب نہیں اگر کسی کو معلوم ہو گیا تو میں منہ دکھانے کے لائق بھی نہ رہوں گا۔"

"کیوں؟ کیا میں آپ کے پاس کسی برائی کے لئے آئی ہوں؟ یا آپ کی نیت میرے ساتھ زیادتی کرنے کی ہے؟ میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ میں آپ سے محبت کرتی ہوں اور آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔"

کمرے میں گہری خاموشی طاری ہو گئی۔ پروین نے انتہائی بے باکی کے ساتھ ایک ایسی بات

کہہ دی تھی جو میں اس کی زبانی شرما شرما کر بھی نہ سننا چاہتا تھا۔ اول تو میرا شادی کا کوئی ارادہ ہی نہ تھا۔ دوسرے میں ایک لڑکی سے صرف اس لئے شادی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ مجھ سے محبت کرتی ہے اور میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ میں نے کہا۔

"ابھی تم جاؤ پروین! جا کر سو رہو۔ پھر کسی دوز اس موضوع پر بات کریں گے۔"

مجھے پروین کی سسکیوں کی آواز سنائی دی۔ وہ رو رہی تھی۔ میں پریشان ہو گیا۔ یا اللہ یہ کس مصیبت میں پڑ گیا ہوں۔ میں نے کہا۔

"روؤ نہیں پروین! کسی نے تمہاری آواز سن لی تو میں خودکشی کر لوں گا۔ اگر پرویز یا تمہاری والدہ یا کوئی اور اندر آ گیا تو کیا ہو گا؟"

پروین نے غصے میں کہا۔

"جو ہونا ہو گا، ہو جائے گا۔ مجھے کسی کی پرواہ نہیں۔ میں سب کے سامنے صاف صاف کہہ دوں گی کہ مجھے تم سے محبت ہے اور میں اپنی مرضی سے آئی ہوں۔"

میں نے اپنا سر پکڑ لیا۔

"اچھا اب تم میرا کہا مانو اور جا کر سو جاؤ۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ کل تم سے اسی موضوع پر پھر بات کروں گا۔"

"آپ جھوٹ بول رہے ہیں۔ آپ آپا زینت سے محبت کرتے ہیں۔ آپ مجھ سے اپنے دل کی بات چھپا رہے ہیں۔ میں رو رو کر مر جاؤں گی۔ مگر یہاں سے نہیں جاؤں گی۔"

اچانک باہر کچھ آہٹ سی ہوئی۔ میں لرز گیا۔ یا اللہ خیر۔ با مجھے اس گناہِ بے لذت سے محفوظ رکھنا۔ میں جلدی سے اُٹھ کر دروازے کے پاس گیا اور کان لگا کر سننے لگا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ پھر کھڑکی کے باہر کسی کتے کی آواز آئی۔ وہ ہڈیاں چبا رہا تھا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا اور پروین کے پاس آکر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اٹھایا اور کہا۔

"اب تم آرام کرو پروین! پھر کبھی سہی۔"

"نہیں نہیں میں نہیں جاؤں گی۔ میں نہیں جاؤں گی۔"

اور اتنا کہتے ہوئے وہ مجھ سے لپٹ گئی۔ اس نے اپنی دونوں باہیں میرے گلے میں ڈال دیں۔ میں کانپ اٹھا۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میرے دل کا شیطان بیدار ہو کر آنکھیں ملنے لگا۔ اور میری طرف فتحمندی سے دیکھ دیکھ کر مسکرانے لگا۔ میں نے اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہوئے پروین کے بازو اپنی گردن سے الگ کیے اور کہا۔

"خدا کے لئے چلی جاؤ پروین، ضد نہ کرو۔"

"میں نہیں جاؤں گی۔ ہرگز نہیں جاؤں گی۔"

"آخر تم اس وقت مجھ سے چاہتی کیا ہو؟"

"مجھ سے وعدہ کریں کہ آپ زینت آپا سے پھر کبھی نہیں ملیں گے۔"

"میں وعدہ کرتا ہوں۔"

"دوسرا وعدہ کریں کہ آپ سوائے میرے اور کسی سے شادی نہیں کریں گے۔"

میں یہ بھی وعدہ کرتا ہوں۔

"سچ؟" پروین نے اچانک خوش ہو کر بیتابی سے پوچھا اور بے اختیار ہو کر میرا منہ چوم لیا
میں ابھی سنبھل بھی نہ پایا تھا کہ وہ لپک کر دروازے کی طرف بڑھی اور دروازہ کھول کر غائب
ہو گئی۔ عجیب پاگل لڑکی تھی۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ دروازے پر کنڈی چڑھائی اور بستر
میں آکر لیٹ گیا۔ گھڑی دیکھی۔ اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ میں جلدی سے بستر
میں گھس کر سو گیا۔

دوسرے روز جتنی دیر میں گھر پر رہا میں نے پروین کو بات بات پر مسکراتے دیکھا۔ پاگل لڑکی
بڑی خوش خوش پھر رہی تھی۔ میرے ایک جھوٹے وعدے اور دھوکے کی تسلی نے اس کی دنیا
ہی بدل دی تھی۔ اس وقت مجھے خیال آیا کہ اگر اسے معلوم ہو گیا کہ میں نے اس سے دھوکہ کیا ہے۔
تو اسے کس قدر صدمہ ہو گا۔ مگر میں کیا کرتا۔ اس کی اور اپنی عزت کی خاطر مجھے ایسا کرنا ہی پڑا تھا۔
اب مجھ پر ایک ہی دھن سوار تھی کہ شام کو زری سے ملنے جانا ہے۔ میں نے شام کو غسل کیا۔ بہترین
لباس زیب تن کیا۔ اور پرویز کی جیپ میں بیٹھ کر مال کی طرف روانہ ہو گیا۔ پرویز راستے میں مجھ سے
مذاق کرتا رہا۔ میں نے کہا۔

"تم سینما پر میرا انتظار کرنا میں تمہیں بعد میں وہاں ملوں گا۔ اور ساری کہانی سناؤں گا"
یہ بات پرویز کو بھی معلوم تھی۔ کہ میں عشق میں سنجیدہ نہیں ہوں اور محض وقت گذارنے
کا سہارا تلاش کر رہا ہوں۔ یا یہ کہ میری شکار پسند طبیعت ایک نیا۔ ماڈرن اور ٹیڈی شکار چاہتی تھی
اس وقت سوا سات بج رہے تھے۔ میں نے پرویز کو سینما کی طرف روانہ کر دیا اور خود بنڈی پوائنٹ
کی طرف آ گیا اور جہاں زری نے مجھے ملنے کا وعدہ کیا تھا وہاں آکر کھڑا ہو گیا۔

جوڑے میرے قریب سے آگر گذر جاتے۔ میں سگریٹ پیتا رہا اور جنگلے پر بیٹھا اپنی ٹیڈی محبوبہ کا انتظار کرتا رہا۔ آدھ گھنٹہ گذر گیا اور زری ابھی تک نہیں آئی تھی۔ میں کچھ پریشان سا ہو گیا۔ موسم بھی بڑا خوشگوار تھا۔ شام ہو رہی تھی۔ مال کی روشنیاں جگمگانے لگی تھیں۔ مغرب کی طرف اگرچہ سورج غروب ہو چکا تھا لیکن پھر بھی ابھی آسمان پر اس کی تھوڑی تھوڑی روشنی رہتی تھی۔ پورے آٹھ بجے زری کی شکل نظر آئی۔ اس کی شکل دیکھ کر میں انتظار کی ساری کوفت بھول گیا۔ اس نے بڑا خوبصورت اور چست لباس پہن رکھا تھا۔ اس کے سویٹر کا رنگ عنابی تھا اور بالوں میں زرد رنگ کا کلپ لگا تھا۔

میں آگے آگے چل پڑا اور وہ میرے پیچھے پیچھے آنے لگی۔ جب ہم ذرا دور آ گئے تو میں زری کے ساتھ شامل ہوا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔

"تم نے بڑا انتظار کروایا زری!"

"صرف بیس منٹ دیر ہو گئی۔ اچانک چائے پر کچھ مہمان آ گئے تھے۔"

"خدا کا شکر ہے کہ تم آ گئیں میں تو ناامید ہو چلا تھا"

زری نے میری اس بات کا کوئی جواب نہ دیا اور بڑی شاہانہ چال چلتی میرے ساتھ ساتھ چلتی گئی۔ اسکی ناک بڑی پیاری لگ رہی تھی۔ بالکل قلوپطرہ کی ناک تھی۔ میں نے کہا

"کہیں بیٹھ کر چائے پئیں۔"

"مال پر میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی۔ وہاں میرے کزن گھوم رہے ہیں۔ یہاں کہیں بیٹھ جاؤ۔"

پنڈی پوائنٹ کے آخیر میں ایک درمیانے درجے کا ہوٹل ہے جہاں کیبن بھی بنے ہیں اور ان پر ریشمی پردہ بھی گرا ہے۔ میں زری کو وہاں لے گیا۔ ہم کیبن میں آکر بیٹھ گئے۔ بجلی کی روشنی میں میں نے پہلی بار زری کو بڑے غور سے اور قریب سے دیکھا۔ وہ اتنی خوبصورت نہیں تھی صرف جوان تھی۔ رنگ گورا تھا اور چہرے اور جسم پر نوعمری کا جوبن اور چمک تھی۔ البتہ انکھوں کے گرد سیاہ حلقے سے پڑے ہوئے تھے۔ ایک رخسار پر چھوٹا سا مسّہ بھی تھا۔ میری امیدوں کا محل تھوڑا سا گر پڑا۔ مگر میں اس سے عشق تھوڑے کر رہا تھا۔ میں تو محض اس سے دل لگی کرنا چاہتا تھا کیونکہ جتنی کشش اس کے بدن میں اتنی نہ تھی جتنی اس کی شاہانہ چال اور دیکھنے اور بات کرنے کے انداز اور آواز کے اُتار چڑھاؤ میں تھی۔ عورت کے جسم پر مرنے والا مرد اس سے بھر جاتا ہے۔ لیکن اس کی اداؤں کا دیوانہ کبھی سیر نہیں ہوتا۔ زری کی انگلیاں لمبی اور دلکش تھیں۔

میں نے کہا

"کل تمہاری چھوٹی بہن سے ملاقات ہوئی تھی۔ مگر تم نہ مل سکیں۔"

"کہاں ؟"

زری نے ذرا تشویش سے پوچھا۔ میں نے اصل بات چھپا کر کہا :

یہیں مال پر ___ دور سے ملاقات ہو گئی۔ کاش تم بھی ساتھ ہوتیں۔

زری نے آرام سے آنکھیں بند کر لیں اور پھر کھول دیں۔ میں سمجھ گیا کہ چھوٹی بہن نے بڑی بہن سے میرے بارے میں کوئی بات نہیں کی۔ اس نے اسے راز رکھا تھا۔ اب میں بھی اسے راز رکھنا چاہتا تھا۔ اتنے میں وہاں چائے آگئی۔ میں نے زری کو چائے بنا کر دی۔ وہ چائے پینے

لگی۔ اس کے بالوں کا رنگ بھورا تھا۔ اور سر کے بیچ میں مخروطی مینار کی طرح اوپر کو اُٹھے ہوئے

تھے۔ زری نے اچانک پوچھا۔

"تم کام کہاں کرتے ہو؟"

میرے لئے یہ سوال اچانک سا تھا اور غیر متوقع بھی۔ لیکن پھر خیال آیا کہ اجکل کی ٹیڈی ماڈرن اور

اعلےٰ طبقے کی لڑکیاں یہ ضرور پوچھتی ہیں تاکہ انہیں معلوم ہو سکے کہ جس شخص کے ساتھ وہ مال پر

گھوم رہی ہیں۔ اس کی سوشل حیثیت کیا ہے۔ میں اگرچہ ایک بنک کا اکاونٹنٹ ہوں اور میری

تنخواہ صرف ساڑھے چار سو روپے ماہانہ ہے۔ لیکن میں نے اپنی عزت کو چار چاند لگانے کیلئے

کہہ دیا۔

لاہور میں موٹر سپیئر پارٹس کی امپورٹ کا بزنس کرتا ہوں۔ بال پر اپنا دفتر ہے۔ اپنی

کار میں آنا تھا کہ پنڈی اگر وہ خراب ہو گئی۔ اس لئے بس ہی میں بیٹھ کر آنا پڑا۔ چلو یہ تو بڑا اچھا ہوا

وگرنہ تم سے ملاقات نہ ہوتی۔

یہ سن کر کہ میرا اپنا کاروبار بھی ہے۔ زری کے چہرے پر رونق سی آگئی اور اب اس نے

میری باتوں میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔ کہنے لگی۔

"کب تک یہاں ٹھہرو گے؟"

"اس مہینے کے آخر تک تو ضرور ٹھہرونگا۔ سنی بنک میں دو ہزار کا فلیٹ لے رکھا

ہے۔ دس روز ٹھہر کر واپس چلا گیا تو کوئی فائدہ نہ ہوگا۔"

"کیا نام ہے فلیٹ کا؟"

میرے منہ سے پرویز کے فلیٹ کا اصلی نام نکل گیا۔ زری نے کہا۔

"میں کل وہاں آؤں گی۔ تم ہو گے ناں؟"

"ضرور ضرور!"

میں تو کانپ گیا۔ اب کیا ہو گا؟ وہاں تو سوائے میرے کمرے کے اور کوئی بھی ایسی جگہ نہیں جس پر میرا قبضہ ہو۔ زری آئے گی تو اس پر میری مکاری اور جھوٹ کا سارا پول کھل جائے گا۔ خیر میں نے سوچا کہ دیکھا جائے گا۔ میں نے بھی پوچھا۔

"تمہارے ڈیڈی کیا کرتے ہیں زری؟"

اب جو اس نے اپنے باپ کا بتایا تو میرا نعوذ سرد پڑ گیا۔ کیونکہ جس لڑکی سے میں محض وقت گزاری کی غرض سے جنسی تعلقات استوار کرنا چاہتا تھا۔ وہ لاہور کے ایک انتہائی امیر ترین کاروباری شخصیت کی بیٹی تھی اور ڈاکٹری کر رہی تھی۔ اب میں زیادہ محتاط ہو گیا۔ میں نے بڑی مکاری سے کام لے کر اس کا جھوٹ موٹ احترام کرنا شروع کر دیا۔ اور اظہار عشق بھی کر دیا۔ زری نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور بولی۔

"محبت کیا ہوتی ہے! میں تو اسے بالکل نہیں سمجھ سکی۔"

"کیا تم نے کبھی سمجھنے کی کوشش کی ہے زری؟ تمہیں معلوم نہیں کہ محبت دو روحوں کے پاک رشتے کا نام ہے۔"

اب میری زبان کو بھی قوت گویائی مل گئی تھی۔ میں نے ایک ہی پل میں اپنے مستقبل کے محل تعمیر کر لئے تھے۔ میں اپنے مستقبل کی بہتری کے لئے ہر قیمت پر اب زری کو حاصل کرنا چاہتا

تھا۔ اگر مجھے زری مل گئی تو مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔ یہ لڑکی دولت، کار، بنگلہ، ماہوار معقول آمدنی ساتھ لائے گی۔ اس کا باپ مجھے شادی کے بعد اپنی فرم کا کسی نہ کسی جگہ منیجر لگا دے گا۔ کوٹھی اور کار ساتھ ملے گی۔ اس کے علاوہ اور کیا چاہیے بھلا۔ میں نے فیصلے پر فوری طور پر عمل درآمد شروع کر دیا۔ اور چکنی چپڑی اور محبت بھری باتوں سے زری کو اپنے قابو میں کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ میں نے تیندوے کی طرح اپنے ہزاروں پاؤں باہر نکال کر پھیلا لئے اور زری کو پھانسنے لگا۔ میں اس حقیقت کو بھول ہی گیا تھا کہ زری بھی اصل میں مجھے پھانس رہی تھی۔ ٹھیک ہے کہ اس کا باپ امیر تھا اس کا لاہور اور یورپ میں لاکھوں کا بزنس تھا۔ لیکن زری کے اخراجات حد سے بڑھے ہوئے تھے۔ باپ سے جو جیب خرچ ملتا تھا۔ وہ دس روز میں ختم ہو جاتا تھا۔ باقی وقت کیلئے اسے روپوں کی ضرورت تھی۔ اور روپوں کے لئے اسے کسی بے وقوف امیر عاشق کی ضرورت تھی۔ وہ مجھے بے وقوف امیر عاشق خیال کر رہی تھی۔ اور میں نہایت مکّار غریب جعل ساز تھا۔

بہر حال ہم دونوں ایک دوسرے کو پھانسے ہوئے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا۔ کہ زری ایک خاص وقت کے لئے مجھے شکار کرنا چاہتی تھی۔ اور میں اسے ساری عمر کے لئے شکار کر کے اپنے مستقبل کے ریفریجریٹر میں بند کر کے رکھ لینا چاہتا تھا۔ تاکہ وقتِ ضرورت دروازہ کھول کر اس کا لذیذ گوشت کھا کر اپنی بھوک مٹاتا رہوں۔

۳

واپسی پر میں زری کو ایک جنرل مرچنٹ کی دکان میں لے گیا۔ میں اسے اسی کے تیر سے شکار کرنا چاہتا تھا۔ میرے پاس کل چالیس روپے تھے۔ میں نے تیس روپوں کا اسے سنگار کا سامان لے دیا۔ زری بڑی خوش ہوئی۔ وہ مجھ سے یہی چاہتی تھی۔ اور میں اس پر صرف یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ میں صرف ایک خاص وقت کے لئے ہی نہیں بلکہ بہت دیر تک، بلکہ زندگی بھر تک اس کے کام آسکتا ہوں۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ میں صرف شادی تک ہی اس کے ساتھ رہنا چاہتا تھا کیا کروں، غریب حالات میں پیدا ہوا ہوں۔ اپنے ارد گرد امیر حالات کا جائزہ لیتا ہوں۔ چاروں طرف دولت کی ریل پیل دیکھتا رہا ہوں۔ میں یہ بھی دیکھتا ہوا کہ دولت ہر مشکل کو آسان کر دیتی ہے اور دولت نہ ہو تو ہر نیکی گناہ بن جاتی ہے۔ میں بھی ایک کوٹھی ۔ اور بنک میں کچھ روپیہ چاہتا ہوں۔ لیکن میں ساری عمر بھی نوکری کرتا رہوں تو یہ چیزیں حاصل نہیں کر سکتا۔ جس

بنک میں کام کرتا ہوں وہاں لاکھوں کا لین دین ہوتا ہے۔ امیر سے امیر آدمی کو وہاں کار میں آتے جاتے دیکھتا ہوں۔ امیر آدمی بننا چاہتا ہوں۔ اس لئے زری کو حاصل کرنا ضروری ہے۔ میں نے زری سے دوسرے روز ملنے کا وعدہ لیا اور گھر آگیا۔ پرویز کو میں نے صرف اتنا ہی بتایا کہ زری سے محبت کا اظہار کر دیا ہے اور بس ——— دل کے فیصلے سے میں نے اُسے آگاہ نہ کیا۔ میں اپنے دل کی بات ابھی دل ہی میں رکھنا چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ بیج مٹی کے اندر دبا دبا وہاں سے حرارت اور نمی حاصل کرتا رہے اور عین وقت پر باہر شگوفہ بن کر پھوٹ نکلے۔ میں نے صرف اتنا کیا کہ پرویز سے دو سو روپے قرض لے لیے۔ دوسرے روز میں پھر زری سے مال پر ملا۔ اس دفعہ ہم دونوں سینما کے ہال میں جا کر بیٹھ گئے۔ زری نے آج نیا جوڑا پہن رکھا تھا۔ اور اس کے جسم میں ایک نئی اور دل آویز کشش پیدا ہو گئی تھی۔ اس روز بھی میں نے اسے ساٹھ روپے کا ایک سوٹ پیس لے کر دیا۔ زری کو یقین آگیا تھا کہ میں اس کی محبت میں بری طرح گرفتار ہو چکا ہوں اور اب میں اس کے دام سے نکل نہیں سکتا۔

بے وقوف لڑکی مجھے الّو بنا رہی تھی۔ اسے کیا خبر تھی کہ وہ خود الّو بن رہی ہے عورت کتنی ہی چالاکی سے کام کیوں نہ لے۔ وہ مرد کو الّو کبھی نہیں بنا سکتی۔ وہ آخر میں خود دھوکا کھا جاتی ہے اور ہمیشہ نقصان میں رہتی ہے۔

چوتھے روز میں اسے ساتھ لے کر کشمیر پوائنٹ کی طرف ایک اُجاڑ علاقے میں لے گیا۔ یہاں درختوں کے نیچے ہم ایک جگہ بیٹھ گئے۔ میں نے سگریٹ

نکال کر سلگایا۔ شوق کے طور پر زری نے بھی اس کے دو چار کش لگائے۔ میں نے زری کو آغوش میں لینا چاہا تو وہ ذرا پرے ہٹ گئی۔ پھر اسے خیال آیا ہو گا کہ شکار کنڈی سے نکل جائے گا۔ چنانچہ جب دوسری بار میں نے پیش قدمی کی تو وہ اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلی۔ میں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ میں نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں تو وہ سمٹ گئی۔ میری انگلیاں اس کے بالوں کے عین درمیان میں رکھی ہوئی کسی سخت سی چیز سے ٹکرائیں۔

یا اللہ! جوان لڑکی تھی یا لکڑی کی گڑیا۔

اس کے ہونٹوں کی لپ سٹک سے عجیب سی دوائی ایسی بو اٹھ رہی تھی۔

"خدا کے لئے کوئی آ جائے گا"

"کوئی نہیں آتا"

"میرا میک اپ خراب ہو جائیگا"

میں پرے ہٹ گیا۔ زری نے جلدی سے پرس میں سے شیشہ نکال کر بال درست کئے۔ لپ سٹک لگائی اور گالوں پر پف مارا۔ پھر مسکرا کر بولی۔

"تم بڑے شریر ہو"

"تم بڑی حسین ہو زری"

حالانکہ زری اتنی حسین نہ تھی۔ کیونکہ جب میں اس کا بوسہ لے رہا تھا تو اس کے دائیں رخسار کا سیاہ مسّہ میری ایک آنکھ پر چھاپے کی طرح لگ گیا تھا۔ اور

علاوہ ازیں اس کی آنکھوں کے سیاہ حلقے زیادہ نمایاں تھے۔

لیکن زری کے حسن اور جسم سے اب کوئی لگاؤ نہیں رہا تھا۔ اب تو مجھے اس کے باپ کے بنک بیلنس اور اس کے کاروبار سے محبت تھی۔ عشق تھا۔ میں اس کے باپ کی چیک بک کے گلابی رخساروں کا عاشق تھا۔ اس کے کاروبار کا دیوانہ تھا۔ اس کی کاروں اور کوٹھیوں کا متوالا تھا۔

"زری جب میں تمہاری آنکھوں میں جھانکتا ہوں۔ تو مجھے سات سمندروں کی گہرائی دکھائی دیتی ہے۔"

زری نے مسکرا کر کہا۔

"کیا ان سمندروں میں جہاز بھی چلتے نظر آتے ہیں؟"

میں اسے کہنا چاہتا تھا کہ ہاں ان آنکھوں کے سمندروں میں اس کے باپ کے سامان سے لدے ہوئے جہاز بھی مجھے دکھائی دیتے ہیں۔ مگر میں نے کہا۔

"جہاز نہیں زری! مجھے پھولوں سے لدی ہوئی کشتیاں نظر آتی ہیں۔"

حالانکہ پھولوں کی کشتیوں سے مجھے کوئی سروکار نہ تھا۔ پھول کھا کر میں زندہ نہ رہ سکتا تھا۔ مجھے تو لوہے اور فولاد سے بھرے ہوئے جہاز چاہیے تھے۔ جو لوہا لے کر یورپ جا رہے ہوں اور سونا لے کر واپس آ رہے ہوں۔

گھاس میں سفید اور بسنتی رنگ کا ایک خوبصورت پھول کھلا ہوا تھا۔

میں نے فلموں میں دیکھا تھا اور کتابوں میں پڑھا تھا کہ اس موقع پر محبوبہ کے بالوں میں ایک پھول ضرور لگایا جاتا ہے۔ چنانچہ میں نے وہ پھول توڑ لیا اور اسے زری کے بالوں میں سجا دیا۔

"خدا کے لئے میرے بالوں کو خراب نہ کرو۔"

میں نے کہا

"یہ پھول میں تمہارے بالوں میں لگانا چاہتا ہوں۔ یہ پھول صرف تمہارے بالوں کے لئے یہاں کھلا تھا۔ ٹھہرو! مجھے اسے سجا لینے دو۔"

"اس کی جڑوں سے مٹی جھاڑ لو"

میں نے جلدی سے پھول کو ایک جھٹکا دے کر جھاڑا اور پھر زری کے بالوں میں لگا دیا۔

زری نے میرے فلیٹ یعنی میرے دوست کے فلیٹ پر آنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ میں اس خواہش کو روکتا رہا۔ آخر ایک روز اس نے بے حد اصرار کیا۔ اس خیال سے کہ کہیں کھیل بگڑ نہ جائے۔ میں نے اسے ایک روز دعوت دے دی۔ میں نے پرویز سے ساری بات کر لی تھی۔ اس نے اس روز اپنی ساری فیملی کو نتھیا گلی بھجوا دیا تھا۔ ساری کوٹھی کی صفائی کروا دی تھی۔ دو نوکر ایک روز کے لئے وقتی طور پر ملازم رکھ لئے۔ چار بجے زری اپنے باپ کی گاڑی میں گئی۔ میں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ ڈرائنگ روم میں چاروں طرف دیکھا۔ باہر حسب

کھڑی تھی۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"میں نے لاہور سے اپنی جیپ بھی منگوالی ہے۔ کسی روز نتھیا گلی چلیں گے۔"

"دیکھا جائے گا۔"

میں نے بیک وقت تینوں چاروں ملازموں کو بلا کر زری کی خدمت پر مامور کر دیا۔ وہ میری شان و شوکت سے بڑی مرعوب ہوئی۔ اسے یقین آگیا کہ میں بڑا بزنس مین ہوں۔ اور کچھ وقت تک اس کے خوب کام آسکتا ہوں۔ پرویز وہاں نہ آیا۔

زری کو بڑی شاندار چائے پلائی گئی۔ چائے کے ساتھ کئی قسم کے کیک تھے۔ آخر میں میں اس کے ساتھ ہی گاڑی میں بیٹھ کر اسے ایجنسی تک گیا۔ زری کار خود چلا رہی تھی۔ راستے میں اتفاق سے میرے دفتر کے ایک بے تکلف کلرک دوست نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ مجھے ایک عورت کے ساتھ کار میں بیٹھا دیکھ کر دیکھنے کا دیکھتا ہی رہ گیا۔

میں نے یوں ظاہر کیا جیسے میں نے دیکھا ہی نہیں۔ جب میں زری کو چھوڑ کر پیدل واپس ہوا۔ کیونکہ اب میرے پاس بس کا کرایہ بھی نہ تھا۔ راستے میں وہی کلرک مل گیا۔ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"کار میں ابھی تم ادھر گئے تھے؟"

میں نے کہا۔

"نہیں تو"

لڑک نے گالی دی۔

حرامزادے جھوٹ بکتے ہو۔ بتاؤ یہ کیا چکر ہے؟"

چونکہ میرا پروگرام بڑا طویل اور اہم تھا۔ اس لئے میں بڑا محتاط ہو گیا تھا۔

میں نے کہا۔

"بات دراصل یہ ہے یار کہ یہ میرے دوست کی بیگم صاحبہ تھیں۔ میں انہیں اوپر تک چھوڑنے گیا۔

"حرامی! چھوڑنے جارہے تھے یا عشق کرنے؟"

میں نے کہا۔

"توبہ کرو یار! عشق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

اب میں نے بھی اس سے بے تکلفی کی باتیں شروع کر دیں اور بات اصل موضوع سے ہٹ گئی۔ جس وقت میں فضا کا ہارا گھر آیا۔ معلوم ہوا کہ پرویز کی ساری فیملی آگئی تھی۔ پروین میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اور زینت خاموش تھی۔ یہ بیوہ خاتون مجھ سے ناامید ہونے کے بعد کچھ روز بڑے نفرت کے موڈ میں رہی تھی اور اب بالکل ہی خاموش ہو گئی تھی۔ اگست کا مہینہ ختم ہو گیا۔

زری کی واپسی کا وقت آگیا اور میری چھٹیاں ختم ہو گئیں۔ وہ بھی لاہور جانے کی تیاریوں میں لگ گئی اور میں بھی ——— ہماری آخری ملاقات ستمبر میں ہوئی

اس نے مجھے چالیس روپوں کا آخری چرکہ لگایا۔ ایک سادی ساڑھی خریدلی میں خاموشی سے یہ صدمہ برداشت کر گیا۔ لاہور کا اس نے مجھ سے ایڈریس لے لیا۔ اس کے ایڈریس کی ضرورت نہ تھی۔ میں نے فون نمبر لے لیا۔ اس کے باپ کو سبھی لوگ جانتے تھے۔

صبح واپس لاہور جانا تھا۔ میں زری سے آخری ملاقات کر چکا تھا۔ رات کے بارہ بج چکے تھے۔ میں لارنس کے ناول کو ختم کر کے بتی بجھا کر لیٹا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ اب میں دروازہ اندر سے بند کر کے سوتا تھا۔ اٹھ کر دروازہ کھولا تو لپک کر پروین اندر آگئی۔ میں صبر کر کے بیٹھ گیا۔ اب کچھ نہ کر سکتا تھا۔ پروین پلنگ پر بیٹھ گئی اور افسردہ آواز میں بولی۔

"آپ صبح واپس جا رہے ہیں؟"

"ہاں پروین! دفتر میں حاضری دینی ہے۔"

"کیا مجھے بھلا دیں گے آپ؟"

میں نے جھوٹ موٹ کہا۔

"نہیں پروین! میں تمہیں کبھی نہ بھلاؤں گا"

"ہمیشہ یاد رکھیں گے؟"

میں نے پیچھا چھڑانے کے لئے کہا

"ہاں! ہمیشہ یاد رکھوں گا۔"

"ایک بار پھر وعدہ کریں کہ آپ میرے سوا اور کسی سے شادی نہیں کریں گے"۔

میں گھبرا گیا۔ یہ لڑکی تو بالکل پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ بڑے خطرناک وعدے مجھ سے لے رہی تھی۔ مگر میں اس سے پیچھا چھڑانا چاہتا تھا۔ میں نے کہہ دیا۔

"ہاں میں وعدہ کرتا ہوں"۔

"کیا ہے"۔

"یہی کہ میں تم سے شادی کروں گا"۔

"سچ"؟

میں خاموش رہا۔ پروین تڑپ کر بولی۔

"بولیے ناں۔ کیا سچ ہے یہ؟"

"بالکل سچ ہے۔ اب تم خدا کے لئے جاؤ"۔

پروین نے آگے بڑھ کر بالکل بچوں کی طرح سے میرا منہ چوم لیا اور کمرے سے باہر بھاگ گئی۔ میں نے سکھ کا سانس لیا۔ بستر میں گھسا اور سو گیا۔ دوسرے روز میں نے وہی اپنی سفید قمیض، پتلون اور چپل پہنی۔ اٹیچی کیس اٹھایا اور پرویز سے مل کر نیچے آگیا۔ پندرہ منٹ بعد مجھے راولپنڈی جانے والی بس مل گئی۔

۵

لاہور آ کر میں اپنے دفتر گیا۔

کام کرتا رہا اور شام کو اپنے دوست سے ملا۔ میں نے مال روڈ پر اس کے دفتر میں بیٹھ کر ایک دوسرے انداز میں ساری بات سمجھائی۔

بھائی ایک امیر لڑکی کو پھانسا ہے۔ کم بخت نے میرے چار سو روپے خرچوا دیئے ہیں۔ میں نے تمہارے دفتر کو اپنا دفتر بیان کیا ہے۔ تمہارا فون نمبر دے دیا۔ فون آئے تو کہہ دینا کہ تم مینیجر بول رہے ہو۔ ارشد صاحب باہر گئے ہیں ابھی آجائیں گے اور تم مجھے فون پر بلوا لینا۔

میرے دوست نے کہا۔

"شرط یہ ہے کہ میں بھی حصہ لوں گا۔"

میں نے اس کے کندھے پر مکہ مارا۔

"فکر نہ کرو۔ گنگا بہے گی تو تم بھی چونچ بھر لینا۔"

بات طے ہوگئی۔ میرا بہت بڑا فکر دور ہوگیا۔ اب میری سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ کسی نہ کسی طرح سے روپیہ پیدا کیا جائے تاکہ یہاں لاہور میں بھی زری پر خرچ کیا جا سکے۔ اور اسے میری امارت پر شک نہ گذرے۔ میں بنک میں اکاؤنٹنٹ تھا۔ میرے پاس لاکھوں کا حساب کتاب رہتا تھا۔ روپیہ حاصل کرنے کا ایک طریقہ سوچ لیا اور مطمئن ہوگیا۔ جس روز زری نے آنے کا کہا تھا۔ میں نے اسی روز اُسے فون کیا۔

وہ فون پر آئی اور میری جان میں جان آئی۔

اگلے روز شام کو شیزان کا وقت طے ہوگیا۔ اسی روز میں نے ایک خاص حساب میں سے پچاس روپے نکالے اور جیب میں رکھ کر سیدھا شیزان آ گیا۔ اس مقصد کے لئے میں نے اپنے ایک دوست کی کار ادھار مانگ لی تھی۔ اور خود ڈرائیو کر رہا تھا۔ میں نے زری سے صرف ایک جھوٹ بولا تھا کہ میں ایک امیر آدمی ہوں اور اب اس ایک جھوٹ کو نبھانے کے لئے مجھے ہزاروں جھوٹ بولنے پڑ رہے تھے۔ ہزاروں پاپڑ بیلنے پڑ رہے تھے۔ لیکن مجھے اپنی منزل روز بروز روشن اور چمکیلی نظر آ رہی تھی۔ میں اندھا دھند اس کی طرف بڑھا چلا جا رہا تھا۔ ایئر کنڈیشنڈ شیزان کی فضا بالکل سرمی کے سینز کی فضا بنی ہوئی تھی۔ زری کا گورا رنگ اور بھی نکھر آیا تھا اور گالوں پر سرخی آ رہی تھی۔ ہم باتیں بھی کر رہے تھے اور چائے بھی پی

رہے تھے۔ باتیں زیادہ زری کے خوبصورت دنوں کی ہو رہی تھیں۔ اتنے میں ایک خوش پوش نوجوان آیا۔ اس نے آگے بڑھ کر زری کو سلام کیا۔ زری نے بڑی خندہ پیشانی سے اس سے ہاتھ ملایا۔ نوجوان کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے چائے منگوالی۔

"میرا خیال تھا کہ تم ان دنوں مری ہوگی"۔

زری نے مسکرا کر کہا۔

"کل ہی آئی ہوں۔ بڑا پلیزنٹ تھا موسم"۔

میں نے ایک بات دیکھی کہ زری جس طرح اس نوجوان سے جس کا نام سکندر تھا، مسکرا مسکرا کر بات کر رہی تھی۔ اس طرح وہ میرے ساتھ کبھی نہیں مسکرائی تھی۔ جب وہ نوجوان چلا گیا تو زری نے بتایا کہ اس کا کزن ہے اور ولائیت میں کاروبار کرتا ہے۔ ساری گرمیاں ولائیت امریکہ میں رہتا ہے۔ سردیوں میں کبھی کبھی لاہور آتا ہے۔

اگلے روز میں زری کو اپنے یعنی اپنے دوست کے دفتر میں لے آیا۔ دوست کو میں نے ایک گھنٹے کیلئے دفتر سے باہر بھیج دیا تھا۔ خود اس کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے آنے والے فون کا اوٹ پٹانگ جواب دے رہا تھا۔ میں زری کو مرعوب کرنا چاہتا تھا۔ اور اب جبکہ ہمارے ڈرامے میں سکندر مرآن داخل ہوا تھا۔ میں زری کو زیادہ سے زیادہ اپنی طرف راغب کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بعد میں دوست ہی کی گاڑی میں زری کو چھوڑنے چلا گیا۔

دو روز بعد میں نے ایک شام زری کو مال پر اسی نوجوان سکندر کے ساتھ بڑی خوبصورت سرسبز کار میں گھومتے دیکھا۔ دل تھام کر رہ گیا۔ ذہن نے کہا میاں ارشد! یہ جوا تمہارے بس کا نہیں۔ تمہاری ہار یقینی ہے۔ لیکن میں زری کو حاصل کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ زری کے ساتھ میرا اور میرے بچوں کا مستقبل وابستہ تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر میں زری کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تو میری نسل کی خوشحالی کا سلسلہ شروع ہو جائے گا۔ میرے بچے ولائیت میں تعلیم حاصل کریں گے۔ اور ان کے بچے کاروں میں گھومیں گے۔ وگرنہ چھ نسلوں تک میری اولادیں کلرکی کریں گی۔ اور چپل گھسیٹتی پھریں گی۔ سکندر کے ساتھ زری کو دیکھ کر میں گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ معاملے کی نوعیت بڑی سنگین ہو گئی تھی زری بڑی آسانی سے مجھ سے اپنا دامن کھینچ سکتی تھی۔ اور میں کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اسے مجھ سے محبت بھی نہیں تھی۔ جیسی کہ نچلے متوسط طبقے کی لڑکیوں کو ہوا کرتی ہے۔ اور وہ اس محبت کے لئے اپنی جان کی بازی لگا دیا کرتی ہیں۔ زری تو محض اپنا فالتو خرچ پورا کرنے کے لئے مجھے ملا کرتی تھی۔ مجھے بھی اس سے محبت نہیں تھی۔ میں اس کی مدد سے اپنا مستقبل تعمیر کرنا چاہتا تھا۔ وہ مجھے اپنے بٹوے کے طور پر استعمال کر رہی تھی۔ اور میں اسے بطور سیڑھی استعمال کرنا چاہتا تھا۔ اس دوران میں میں نے اس کی چھوٹی بہن سے بہت کم ملاقات کی۔

کیونکہ میری سونے کی انگوٹھی لے کر غائب ہو گئی تھی۔ اور لاہور میں اپنے کسی کزن سے عشق لڑا رہی تھی۔ میں نے سوچا کیوں نہ اس لڑکی کو پھانس لیا جائے ایک بار میں نے کوشش بھی کی۔ لیکن معلوم ہوا کہ اسے میری بالکل پرواہ نہیں۔ اس کا نیا ساتھی ایک انتہائی دولت مند زمیندار کا لڑکا تھا جو اسے عیش کروا رہا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اپنی ساری توجہ زری کی طرف بدل دی۔ کیونکہ بہرحال مجھے یہ لڑکی ملنی تھی۔

میں نے بنک میں سے کوئی چھ ہزار روپے نکلوا لیے اور زری کو دو ہزار کے تحفے لے دیئے۔ ایک ہزار کا سونے کا سیٹ لے کر دیا۔ اور باقی بھی کم و بیش اسی پر خرچ کر ڈالے۔ زری بڑی خوش ہوئی۔ سکندر ولائیت چلا گیا تھا۔ اب میدان صاف تھا۔ اور میں اپنا گھوڑا اس میدان میں سرپٹ دوڑا رہا تھا۔

ایک روز پرویز کا فون آیا کہ آج شام گھر آنا۔ تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔ میں نے دل میں سوچا یا اللہ خیر ہو۔ کوئی ایسی ویسی بات نہ ہو گئی ہو۔ کہیں اس پاگل پروین نے کوئی گل نہ کھلا دیا ہو۔ بہرحال میں شام کو پرویز کے ہاں پہنچا۔ سمن آباد میں اپنی چھوٹی سی کوٹھی کے لان میں وہ بیٹھا اخبار پڑھ رہا تھا۔ خندہ پیشانی سے ملا اُس کی والدہ اور ہمشیرہ سے بھی ملاقات ہوئی۔ اس کی بیگم ذرا علیل تھیں اور اندر لیٹی تھیں۔ چائے ہم نے لان میں بیٹھ کر پی۔ پروین کو میں نے اس اثنا میں بالکل نہ دیکھا۔ میں حیران تھا کہ وہ کہاں گم ہو گئی ہے۔

چائے پر ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد پروین کی شادی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔

"تم میرے گہرے دوست ہو ارشد! میری کوئی بھی گھریلو بات تم سے ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ تم میرے پورے خاندان کو جانتے ہو۔ مجھے تم پر بھروسہ ہے۔ میں تمہیں اپنا بھائی سمجھتا ہوں۔ لیکن ایک بات کا مجھے بڑا دُکھ ہوا ہے۔"

"میں حیران رہ گیا۔"

"کس بات کا پرویز؟ تمہیں کہیں کوئی غلط فہمی تو نہیں ہو گئی"۔

میرا مطلب صرف اتنا ہے کہ تم اگر پہلے مجھ سے بات کر لیتے۔ تو مجھے اتنا افسوس نہ ہوتا۔ جتنا اب پروین کی زبانی سن کر ہوا ہے۔

میں سارا معاملہ سمجھ گیا تھا۔ پروین نے اپنا چکر چلا دیا تھا۔ میں تو سر تھام کر رہ گیا۔ پاگل اور احمق لڑکی نے میرے اچھے خاصے دوست کو مجھ سے برگشتہ کر دیا تھا۔ میں نے پوچھا۔

"پرویز بات کیا ہے؟ پہلے مجھے پوری بات سناؤ"

پرویز نے سگریٹ کا کش لگا کر کہا۔

بات کو طول دینے سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ بات صرف اتنی ہے کہ مجھے معلوم ہو چکا ہے کہ تم اور پروین آپس میں محبت کرتے ہو۔ تم نے پروین سے شادی کا وعدہ کر رکھا ہے اور یہ کہ اب جبکہ اس کی شادی کے دو بار اچھے رشتے آئے

آئے تھے۔ پروین نے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ سوائے تمہارے اور کسی سے بیاہ نہیں کرے گی۔"

میں سناٹے میں آگیا۔ میں کیا پروگرام بنا رہا تھا۔ اور ادھر یہ بے وقوف لڑکی کیا کر رہی تھی۔ یہ تو نخواہ مخواہ کیچڑ اچھالنے والی بات تھی۔ بھلا میرا اس لڑکی سے کیا تعلق تھا۔ میں نے کبھی اس سے محبت نہ کی تھی۔ میں کبھی اس کے پاس راتوں کو چھپ کر نہ گیا تھا۔ میں اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ شادی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ لیکن اب یہ معاملہ نازک صورت اختیار کر گیا تھا۔ پرویز نے مجھے گہری سوچ میں گم دیکھا تو بولا۔

"تو پھر تمہاری کیا رائے ہے؟"

میں نے سگریٹ جلا کر پرویز کو دیکھا۔ اب میں اسے کیا کہتا۔ اگر یہ کہوں کہ میں پروین سے محبت نہیں کرتا۔ اس سے شادی بھی نہیں کرنا چاہتا۔ تو یہ لڑکی اور پرویز کی، دونوں کی توہین تھی۔ گویا جس چیز کو وہ اتنی اہمیت دے رہا تھا۔ میرے نزدیک اس کی ذرا بھی حیثیت نہیں تھی۔ پھر وہ یہ بھی سوچ سکتا تھا کہ میں نے پروین کو دھوکا دیا ہے۔ پہلے اس سے محبت کی۔ اسے خراب کیا اور اب جبکہ شادی کی بات شروع ہوئی ہے۔ تو اسے چھوڑ کر بھاگ رہا ہوں۔

اب میں صرف اس امید پر پرویز سے بات کرنے کی جرأت کر رہا تھا کہ شاید وہ میری بات پر اعتبار کرلے۔ میں نے اسے پوری پوری بات ذہن نشین کروا دی

اور صاف صاف کہہ دیا کہ پروین کو میں اپنی چھوٹی بہنوں کی طرح سمجھتا ہوں۔ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا کہ وہ مری میں وہ دوبار رات کو میرے کمرے میں آگئی اور مجھ سے شادی کا وعدہ لے لیا۔ میں نے صرف اس خیال سے ہاں کردی کہ میں اُسے ناسمجھ بچی سمجھتا تھا اور چاہتا تھا کہ وہ جسطرح سے بھی ہو سکے میرے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں چلی جائے۔ کیونکہ اس میں سارے خاندان کی بدنامی تھی۔

پرویز میری باتیں حیرانی اور ندامت سے سنتا رہا۔ مجھے اس بات کا افسوس بھی ہوا کہ میں نے ایسی باتیں کیوں کہیں۔ مگر اس کے سوا چارہ بھی کوئی نہ تھا۔ میں پرویز کو غلط فہمی میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ میں اس پر بات کھول دینا چاہتا تھا چنانچہ میں نے کھرا کھوٹا اس کے سامنے رکھ دیا۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا۔

پرویز نے گہرا سانس لیا اور بولا۔

"پھر تو سارا معاملہ ہی یک طرفہ ہے۔ کوئی بات نہیں۔ تم اطمینان رکھو۔ میرے دل میں تمہاری عزت دوگنی ہو گئی ہے۔ میں سارا معاملہ خوش اسلوبی سے حل کر لوں گا۔"

میں نے کہا۔

میں اتنی بات ضرور کہوں گا کہ پروین میری بہن ہے۔ لیکن وہ پاگل ہے۔ اسے شفقت سے سمجھانا۔ مجھے ڈر ہے کہیں وہ جذبات میں آکر ایسی ویسی

حرکت نہ کر بیٹھے۔

پرویز خاموشی سے سگریٹ پیتا رہا۔ اس بات کا اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ جب اس کی خاموشی ناقابلِ برداشت ہو گئی تو میں نے اجازت لی اور گھر واپس آگیا

اس شام میں نے زری سے ملاقات کا وقت لیا اور دفتر میں جو "خاص حساب" معمول رکھا تھا۔ اس میں سے دو ہزار روپے مزید نکلوا کر اپنے بٹوے میں رکھ لیے ابھی چار بجے تھے اور زری سے میں پورے چھ بجے مل رہا تھا۔ میں نے ٹیکسی پکڑی اور مال روڈ پر سیدھا چھاونی کی طرف نکل گیا۔ میں وقت گذارنا چاہتا تھا۔

ویسے بھی جب سے میں نے دفتر میں سے ناجائز طریق سے روپے نکلوانے شروع کئے تھے۔ میرا ذہن کچھ پریشان رہنے لگا تھا۔ میں اگر کسی جگہ ایک پل کے لئے خاموش اور بے حرکت بیٹھ جاتا تو میرا ضمیر مجھے ملامت کرنے لگتا۔ میں بےچین سا ہو جاتا۔ میں اب ہر وقت حرکت میں رہنا چاہتا تھا۔ ٹرین میں۔ کار میں، ہوائی جہاز میں میرا ضمیر مجھے تنگ نہیں کرتا تھا۔ چار بجے سے چھ بجے تک کے دو گھنٹے گذارے نہ گذرتے تھے۔ اسی لئے میں نے ٹیکسی پکڑ کر مال روڈ پر آوارہ گردی شروع کر دی تھی۔

میری گاڑی جب گورنمنٹ ہاوس کے سامنے سے گذری تو اچانک میری نظر زری کی چھوٹی بہن یعنی بیٹھی ہوئی ناک والی لڑکی پر پڑ گئی۔ وہ اکیلی فٹ پاتھ پر چلی جا رہی تھی۔ میں نے ٹیکسی اس کے قریب لے جا کر کھڑی کی اور مسکرا کر پوچھا

"کیا آج پیدل چلنے کا دن منایا جا رہا ہے"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر ذرا سا ہنس کر بولی۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں"

میں نے کہا۔

"جہاں تم جا رہی ہو"

"تو پھر مجھے گلبرگ تک چھوڑ آیئے۔ کار باجی لے گئی تھی۔ میں نے سوچا بس پکڑ لوں گی"

"اندر آجاؤ"

وہ اندر آگئی اور ہم گلبرگ کی طرف چل پڑے۔

"آپ کدھر جا رہے ہیں"

"آوارہ گردی کر رہا تھا"

"یہ کام کب سے شروع کر دیا؟"

"جب سے تم نے منہ موڑا ہے"

اس پر وہ شرما سی گئی۔ مگر پھر اس کا ڈھیٹ پن اس کے بدنما سے چہرے پر آگیا اور وہ کہنے لگی۔

"میں نے تو کبھی منہ نہیں موڑا۔ ویسے آپ ہی مجھ سے الگ الگ رہنے لگے۔ اور باجی کی طرف جھک گئے ہیں"

میں نے مصنوعی حیرانی سے پوچھا:

"تم سے کس نے کہا ہے"

وہ ہنس پڑی۔

آپ مجھے اتنی بے وقوف مت خیال کریں۔ مجھے کم از کم اپنے گھر کے افراد کا پورا پورا علم ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ آپ باجی کو بڑے بڑے پریزنٹ لا کر دیتے ہیں اور آپ کی روزانہ ملاقات ہوتی ہے۔ اور آج بھی آپ اس سے پورے چھ بجے مل رہے ہیں

اب میں نے ہتھیار پھینک دیئے اور چہرے پر سے تصنع کا نقاب اتار دیا۔

"تو اس میں برائی کیا ہے رعنا! میں زری سے محبت کرتا ہوں۔ میری محبت بے لوث ہے۔ میں محبت کا جواب اس سے "محبت" چاہتا ہوں۔ روح کی محبت بے پایاں اور بے غرض محبت!"

وہ طنزیہ انداز میں مسکرائی۔

"آجکل کی لڑکیاں روح کی محبت کے معنی نہیں جانتیں۔

"محبت کا روح سے نہیں اس زندگی سے اور جسم سے تعلق ہوتا ہے۔ آپ کی محبت کہاں تک بے غرض ہے یہ میں نہیں جانتی۔ مگر اتنا ضرور جانتی ہوں کہ باجی آپ سے نہیں بلکہ کسی اور سے محبت کرتی ہے۔ اور اس شخص سے اس کی پچھلے دنوں منگنی ہو گئی ہے۔"

مجھ پر گویا بجلی سی گر پڑی۔ میرے سارے محل ایک ایک کر کے گرنے لگے۔
میں رعنا کا چہرہ ہی تکتا رہ گیا۔ میں یہ تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ زری مجھ سے
اتنی جلدی جدا ہونے کا پروگرام بنا رہی ہے۔ میں اس کے لئے، اپنے مستقبل
کے لئے، اپنی عزت، اپنی شہرت۔ اپنی نیک نامی اور اپنی ساری
زندگی کی بازی لگا دی تھی۔ لیکن وہ مجھ سے اپنا پلہ چھڑا رہی تھی۔ میں نے
رعنا سے پوچھا۔

"اس نوجوان کا نام سکندر تو نہیں؟"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"میں ایک روز اسے زری کے یہاں شیزان میں ملا تھا۔"

" ہاں وہی نوجوان اگلے برس گرمیوں میں زری سے شادی کر رہا ہے۔"

میں نے دیکھا کہ رعنا کی انگلی میں میری انگوٹھی کی جگہ ایک اور سرخ
نگینے والی انگوٹھی چمک رہی تھی۔ اچانک میرا خیال زری کی طرف سے
بدل کر رعنا کی طرف آ گیا۔ مجھے سیڑھی چاہیے تھی۔ زری نہیں تو میری
نسل کی ترقی کا باعث رعنا بھی ہو سکتی تھی۔ یہ بھی اسی امیر خاندان کی لڑکی تھی۔
میں نے اس سے پوچھا۔

یہ انگوٹھی کیسی ہے رعنا؟ میری انگوٹھی کہاں ہے؟

رعنا نے اپنی انگوٹھی پر انگلی پھیر کر کہا۔

"گھر میں پڑی ہے"

"اور یہ کس کی ہے"

"میرے ہونے والے خاوند کی"

"کیا مطلب ؟"

مجھ پر گویا دوسری بار بجلی گری۔ رعنا نے مسکرا کر ماتھے پر آئی ہوئی بالوں کی لٹ پیچھے جھٹک کر کہا

"میں بھی اگلے برس شادی کر رہی ہوں۔ میرا خاوند سوئٹزرلینڈ میں ایمبیسی میں ملازم ہے۔ میں اگلے برس وہاں جا رہی ہوں۔ میں لاہور سے بور ہو گئی ہوں"۔

رعنا سوئٹزرلینڈ جا رہی تھی۔ زری شادی کر کے ولایت جا رہی تھی۔ اور میں دس بارہ ہزار کا غبن کر کے جیل جا رہا تھا۔

مجھے پسینہ آ گیا۔ میرا پروگرام تھا کہ شادی کے فوراً بعد اپنے خسر سے دس بارہ ہزار روپیہ لے کر دفتر کے کھاتے میں ڈال دوں گا اور غبن کے مقدمے سے بچ جاؤں گا۔ کیونکہ وہ حساب ایسا تھا کہ کم از کم ایک سال تک رقم کے غبن کا کسی کو علم نہیں ہو سکتا تھا۔ اب ساری بازی چوپٹ ہو گئی تھی۔ بساط الٹتی دکھائی دے رہی تھی۔ گلبرگ والی کوٹھی آ گئی۔ رعنا شکریہ ادا کر کے اتر گئی۔

"واپس لے چلو"

میں نے ڈرائیور سے کہا۔ گاڑی واپس مال پر آ گئی۔ میں نے مال میکلوڈ

اور چھاؤنی کے دو چار چکر لگائے۔ میں پریشان ہو گیا تھا۔ بہت ہی بے چین ہو گیا تھا۔ مجھے بار بار پسینہ آرہا تھا۔ بہرحال میں نے بڑی ہمت سے کام لیا۔ اور پورے چھ بجے شیزان میں آکر بیٹھ گیا۔ اور زری کا انتظار کرنے لگا۔

سوا چھ بجے وہ آئی۔ اس نے حسبِ معمول بڑا ہی قیمتی اور خوبصورت لباس پہن رکھا تھا۔ بال بڑے سلیقے سے بنائے تھے۔ چال میں وہی شاہانہ پن تھا۔ آنکھوں میں چمک تھی۔ ناک بڑے ٹھاٹھ سے اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا یہ وہ لڑکی ہے جو میرے لئے انتہائی بدنصیبی اور پریشانی کا باعث بن رہی ہے۔ لیکن میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ یہ لڑکی میرے چنگل سے بچ کر نہیں جا سکتی۔ یہ مجھے ذلت کے غار میں دھکیل کر اکیلی نہیں جا سکتی۔ میں نے مسکرا کر اس کا خیر مقدم کیا۔

"سوری ارشد! دیر ہو گئی"۔

"اِٹ اِز آل رائٹ زری"

"کافی"

"یس"

میں نے کافی کا آرڈر دیا اور باتیں کرنے لگا۔

۶

شیزان میں بڑی رونق تھی۔

میں قصداً زری کو اوپر لے گیا۔ اوپر کچھ سکون تھا۔ اب میں سوچنے لگا کہ زری کو منگنی والی بات بتاؤں یا پی جاؤں۔ پھر خیال آیا کہ بات صاف ہو جائے تو اچھا ہے۔ زری کہہ رہی تھی۔

"فرحت علی جیولرز کے پاس ایک بڑا خوبصورت بروش دیکھ کر آ رہی ہوں۔ اتنا سویٹ تھا کہ کیا بتاؤں۔"

ظاہر ہے اس کا مطلب تھا کہ میں اسے وہ بروچ خرید کر لے دوں۔

میں نے کہا۔

"کل خرید لیں گے۔ ایسی کیا بات ہے۔"

کچھ دیر ادھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ بڑے مزے سے کافی پیتے رہے

میرے دل میں ایک ہی بات بار بار ابھر رہی تھی۔ کہ کسی نہ کسی طرح منگنی والی

بات کی صفائی ہو جائے۔ آخر کار میں نے ذکر چھیڑ دیا۔

"وہ سکندر صاحب آج کل کہاں ہیں؟"

زری کا ماتھا ٹھنکا۔ مگر کیا مجال جو چالاک لڑکی نے ذرا چہرے سے

کچھ ظاہر ہونے دیا ہو۔ کہنے لگی۔

"انگلینڈ چلے گئے ہیں۔"

پھر میں نے صاف صاف پوچھ لیا۔

"زری ایک بات بتاؤ گی؟"

"کیا؟"

میں نے سگریٹ کا ہلکا سا کش لے کر کہا۔

"کیا تمہاری سکندر سے منگنی ہو گئی ہے؟"

زری ایک پل کے لئے خاموش رہی۔ پھر بولی۔

"بالکل نہیں۔ میرا ابھی شادی کا کوئی پروگرام نہیں۔ میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی

یہ تمہیں کس نے کہا؟"

میں رعنا کا نام چھپا گیا۔

"یونہی کسی جگہ سے سنا تھا۔"

"آخر کس جگہ سے۔ مجھے بھی تو معلوم ہو کہ وہ کون لوگ ہیں جنہیں میری شادی کی فکر رہتی ہے؟"

میں صاف سمجھ گیا کہ زری جھوٹ بول رہی ہے۔ وہ ابھی مجھ سے کافی تحفے تحائف لینا چاہتی ہے۔ رعنا نے جھوٹ نہیں کہا تھا۔ میں نے بھی مکاری سے کام لیا۔ اور زری پر یوں ظاہر کیا۔ جیسے اس کی بات پر یقین آگیا ہو۔

"میں بھی سوچتا تھا کہ بھلا ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟ زری کسی اور شخص سے شادی نہیں کر سکتی یا کم از کم جب وہ ایسا کرنے لگے گی تو مجھ سے ضرور ذکر کرے گی۔"

"کیوں نہیں میں اتنی احمق نہیں ہوں کہ گھر والے جہاں اشارہ کر دیں۔ وہاں دلہن بن کر بیٹھ جاؤں۔ میں اپنی مرضی سے شادی کروں گی۔ مجھے اپنے مستقبل کا اپنے ماں سے زیادہ خیال ہے۔"

کس مکاری کے ساتھ یہ چالاک لڑکی اپنا راستہ ہموار کر رہی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی منگنی ہو چکی ہے اور وہ اپنی مرضی کے ساتھ سکندر سے شادی کر رہی ہے۔ میں زری کی چالاکی پر حیران تو بالکل نہ ہوا۔ لیکن چوکنا ضرور ہو گیا۔ کیونکہ اب مجھے اس کے مقابلے میں زیادہ چالاکی اور ہوشیاری سے کام لینا تھا۔ مقابلہ زیادہ چالاک انسان سے تھا۔ زری چلی گئی۔

اگلے روز میں نے اپنے وسائل کی مدد سے اس بات کی تصدیق کر

لی کہ زری کی واقعی منگنی ہو گئی تھی۔ اور اس منگنی میں شہر کی معزز ہستیاں شریک ہوئی تھیں۔ شام کو زری سے پھر ملاقات ہوئی۔ وہ مجھے جیولرز کی دکان پر لے گئی۔ وہاں اس نے وہ بروچ خرید لیا۔ اس کی آٹھ سو روپے قیمت تھی۔ جو میں نے فوراً ادا کردی۔

میرے غبن کی رقم اب تیرہ ہزار ہو گئی تھی۔

اب میں نے اپنے دوست سے ساری بات کھول کر بیان کردی۔ وہ پہلے تو حیران ہوا، پھر سنجیدگی سے معاملات کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے لگا۔

"یار ارشد تم بڑی خطرناک گیم کھیل رہے ہو۔ خدا نہ کرے اگر تم اس لڑکی کو نہ حاصل کرسکے تو تمہارا جیل جانا ناگزیر ہے۔"

میں نے کہا۔

"اس لئے تو میں تم سے مشورہ کررہا ہوں۔ کہ اب کیا کیا جائے؟"

"اور اگر شادی ہو بھی گئی تو تم شادی ہوتے ہی اپنے سسر سے اتنی رقم کیسے لوگے۔"

اس کی تم پروانہ کرو۔ میں اور کچھ نہیں تو زری کے سارے زیورات بنک میں رکھوا کر رقم نکلوالوں گا۔ وہ بیس ہزار سے کم کے زیورات ساتھ نہیں لائے گی۔ تم جانتے ہی ہو وہ ایک امیر ترین باپ کی بیٹی ہے اور

اس کا باپ اس سے کم کے زیورات کبھی نہیں دے گا۔ اس میں اس کی بھی بے عزتی ہو گی۔"

میرے دوست نے کہا

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن سوال ہے کہ یہ شادی اب کیسے ہو گی۔ لڑکی تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔ اس کی منگنی بھی ہو گئی ہے۔ تم اسے اغوا کر کے بھی لے جاؤ تو وہ تم سے ہرگز شادی نہیں کرے گی۔ تمہارے خلاف اغوا کا مقدمہ ضرور درج کروا دے گی۔"

"پھر کیا ہو؟"

"یہی سوچنا ہے،" ہم نے سگریٹ سلگا لیے اور گرم گرم کافی کے دو چار گھونٹ پیئے تو میرا دوست چٹکی بجا کر بولا۔

"آ گیا آئیڈیا۔"

"کیا؟" میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"سنو۔"

اس کے بعد میرے دوست نے مجھے ایک سکیم بتائی۔ سکیم اس قدر جامع اور پر اثر تھی کہ میں اپنے دوست کی عقل پر حیران رہ گیا۔ اور اپنی کوتاہی فکر پہ نادم ہوا۔

"کمال کر دیا تم نے دوست!"

"پھر اس پر آج ہی سے عمل شروع کر دو۔ میدان تمہارے ہاتھ میں ہو گا۔"

"فکر نہ کرو۔ یہ کوئی میرے لئے مشکل بات نہیں۔"

زری سے میں نے پک نک کا پروگرام بنایا۔ شہر سے بیس میل دور میرے دوست نے نہر کے کنارے بڑی پر فضا جگہ پر ایک چھوٹا سا کاٹیج بنایا ہوا تھا۔ یہاں وہ کبھی کبھی اپنے دوستوں کیساتھ عیش و عشرت کی محفلیں سجایا کرتا تھا۔ میں بھی دو تین بار وہاں گیا تھا۔ بڑا پیارا اور آرام دہ کاٹیج تھا۔ وہاں آرام و آسائش کی ہر شے مہیا تھی بجلی اور پانی کا بڑا معقول انتظام تھا۔ پروگرام کے مطابق میں نے مال روڈ کی ایک دکان پر سے وائن کی پوری بوتل خرید کر گاڑی میں رکھی۔ کچھ پھل اور سگریٹ خریدے اور زری کو ساتھ لے کر کاٹیج کی طرف روانہ ہو گیا۔

میرا دوست پہلے ہی سے کاٹیج میں پہنچ گیا تھا۔

زری نے کہا کہ اس کی کچھ سہیلیاں اور دوست دریائے راوی کے کنارے آج پک نک منا رہے ہیں۔ وہ وہاں کچھ دیر ضرور رکے گی۔ میں نے اس خیال سے کہ کہیں زری کو شبہ نہ ہو جائے فوراً اجازت دے دی۔ اور گاڑی کا رخ دریائے راوی کی طرف کر دیا۔ کچھ لڑکے اور لڑکیاں مقبرہ جہانگیر کے عقبی پلاٹ میں درختوں کے درمیان گھاس پر قالین بچھائے بیٹھے تھے۔ کوئی آئس کریم اڑا رہا تھا۔ اور کوئی اورنج کی بوتل ہاتھ میں لئے کسی لڑکی سے باتیں کر رہا تھا ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اپنی چھوٹی سی بچی کو پکڑے اسے چلنا سکھا رہا تھا۔

فضا بڑی خوشگوار اور پرسکون تھی - سورج بادلوں میں چھپا ہوا تھا - اور دریائے راوی کی طرف سے بڑی ٹھنڈی اور مرطوب ہوا چل رہی تھی - اس ہوا میں دریائی سرکنڈوں اور ذخیرے والے درختوں کی گیلی گیلی مہک تھی -

زری کو یہ سب لوگ جانتے تھے - اسے دیکھ کر سب نے شور مچا دیا - اور بڑے خوش ہوئے - زری نے میرا ان لوگوں سے تعارف کروایا - انہوں نے امریکی انداز میں مجھ سے ہاتھ ملائے اور اپنے اپنے شغل میں لگ گئے -

ایک کٹے ہوئے بالوں والی لڑکی باسکٹ میں سے تھرموس نکال کر پیالوں میں گرم گرم کافی انڈیل رہی تھی - ایک لڑکا پاس ہی بیٹھا اس کے جھکے ہوئے جسم کے خطوط کا بغور مطالعہ کر رہا تھا - لڑکی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا -

"تمہیں شرم نہیں آتی روی ؟"

روی جو کہ اس لڑکے کا نام تھا - بولا -

"آئی لو یو نشی ۔"

"شٹ اپ"

نشی نے کہا اور روی قہقہہ لگا کر ہنس پڑا - زری بھی ایک لڑکے سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی - اور مجھے بڑا برا لگ رہا تھا - دوسرے مجھے پروگرام کے مطابق کالج بھی پہونچنا تھا - وہاں میرا دوست انتظار کر رہا تھا - یہاں

جتنے لڑکے لڑکیاں جمع تھے۔ سب ایک ہی برادری اور ایک ہی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ سب ایک دوسرے کے کزن تھے۔ یعنی ایسے رشتے دار جو وقت پڑنے پر ہر قسم کا رشتہ قائم کر سکتے تھے۔ ان میں کوئی زری ہے تو کوئی نشی کوئی امی ہے تو کوئی روشی۔ اور کوئی جمی ہے تو کوئی شیری ـــ کوئی آنٹی ہے اور کوئی سسٹر ہے۔ کسی نے امریکی کاؤبوائز کا لباس پہن رکھا تھا۔ کوئی ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ کسی نے جینز پہن رکھی تھی۔ کوئی خالی نیکر پہنے اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا۔ لڑکے لمبے تڑنگ اور دھان پان تھے لڑکیاں بھی سلم ہونے کی فکر میں بے حد دبلی ہو رہی تھیں۔ ان کے لباس بھی بڑے چست تھے۔ بال کٹے ہوئے تھے۔ کسی کے بالوں کا فیشن برجی بارڈو سے تو کسی کا ملکہ دیبا سے ملتا تھا۔ انہوں نے بھنویں تیکھی بنا رکھی تھیں۔ ہونٹوں پر سرخی کی گہری تہہ جمی تھی۔ اور کپڑوں پر عطر کی پوری شیشی انڈیل رکھی تھی۔

یہ لوگ آپس میں بڑی بے باکی سے باتیں کر رہے تھے۔ کسی بات پر بھی نہ تو شرما رہے تھے۔ اور نہ جھجک ہی رہے تھے۔ ایک لڑکے نے ٹرانسسٹر ٹیپ ریکارڈر چلا دیا۔ ناچ کی دھن بجنے لگی۔ زری اور نشی دونوں مل کر ڈانس کرنے لگیں۔

"تم بھی آجاؤ۔"

"نو تھینک یو"

زری نے مجھے بلایا لیکن میں نے انکار کر دیا۔ ایک تو مجھے ناچنا نہیں آتا تھا۔ دوسرے میرا ذہن اپنے خاص کام کی طرف لگا ہوا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ زری جلد سے جلد یہاں سے فارغ ہو کر میرے ساتھ کاٹیج چلے۔ جہاں پروگرام کے مطابق ہر شے بالکل تیار تھی۔

ادھیڑ عمر کے آدمی نے ایمی کو روک دیا۔

"بی بی یہ شاہدرہ ہے۔ یہاں لوگ جمع ہو جائیں گے۔"

ایمی نے منہ بنایا۔ مگر پھر ڈانس کرنے لگی۔ یہ سب لڑکے لڑکیاں انگریزی تہذیب کے پروردہ تھے۔ یہ انگریزی سکولوں میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ان کی تربیت کانونٹ کے طرز پر ہوئی۔ یہ آنکھیں بند کر کے امریکی انداز میں فرفر کر کے انگریزی بولتے تھے۔ اور اردو میں بات کرنے والوں کو جاہل سمجھتے تھے۔ اردو زبان اور اردو لباس کو یہ مولویوں اور دقیانوسی لوگوں کا ورثہ سمجھتے تھے۔۔ انہیں ایگیھا کرسٹی، پیٹر چینی اور اسی قسم کے گھٹیا امریکی جنسی اور جاسوسی ناولوں کے ٹکڑوں کے ٹکڑے یاد تھے۔ لیکن غالب، میر، کرشن چندر اور پریم چند کے نام سے بالکل ناآشنا تھے۔

اتنے میں ایک نوجوان وہاں آیا۔ سب نے تالیاں بجا کر اس کا استقبال کیا۔ معلوم ہوا کہ اس کا نام پیری ہے اور وہ نجی کا محبوب ہے۔

"ہیلو پیری! ہم تمہیں مِس کر رہے تھے۔"

"میں نے شیزان میں رنگ کیا تھا"

"آئی ایم ساری"

نجمی جیری سے پیار کرتی تھی اور اس کے خوبصورت کپڑوں اور اس کے ریشمی سکارف سے اٹھنے والی سینٹ کی گہری گہری خوشبو پر جان دیتی تھی۔ نجمی نے زری کا اور میرا تعارف جیری سے کروایا۔

زری بولی۔

"جیری! تم یو۔کے۔ نہیں گئے؟"

"میں کناڈا چلا گیا تھا۔ اگلے سال جاؤں گا"

میں حیرانی سے ان لوگوں کی باتیں سن رہا تھا۔ اور منہ تک رہا تھا۔ کہ یہ کتنی آسانی سے کبھی یو۔کے۔ چلے ہیں اور کبھی کناڈا چلے جاتے ہیں۔ ایک ہم ہیں کہ ذرا کوہ مری تک جانا ہو تو دو چار سو قرض لینا پڑتا ہے۔ نجمی نے ہمارے سامنے ہی جیری سے دیر سے آنے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا۔

"میں راوی میں بوٹنگ کر رہا تھا"

اسے یہ بات بڑی بری لگی۔ کہ جس شخص کی خاطر وہ پک نک پر آئی ہے وہ راوی میں اکیلا بیٹھا بوٹنگ کر رہا تھا۔

میں چپکے سے کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔ اتنے میں فشی نے دور سے زری کو آواز دی۔

"زری بھاگ کر ادھر۔"

نشی ایمی کے ساتھ گھاس پر دوڑ رہی تھی۔ زری نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور پھر جوتی اتار کر ایمی کی طرف بھاگ گئی۔ ادھر نجمی برابر چیپری سے ناراض تھی۔ اور کہہ رہی تھی۔

"تم مجھ سے بالکل محبت نہیں کرتے۔ یو آر اے فول۔"

چیپری تھا کہ سگریٹ لگا کر بڑے مزے سے بیٹھا پی رہا تھا۔ نجمی کی بات سن کر بولا۔

"ارے دنیا میں صرف بے وقوف ہی محبت کر سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"تم جھوٹے ہو۔ اگر محبت ہوتی تو دریا پر جانے کی بجائے سیدھے یہاں میرے پاس آتے۔"

"مجھے دریا سے بھی محبت ہے۔"

"شٹ اپ۔"

"ونڈر فل۔"

"اب میں تم سے کبھی نہیں بولوں گی۔ جمی مجھ سے اتنی محبت کرنا چاہتا ہے لیکن میں نے صرف تمہاری خاطر اسے کبھی لفٹ نہیں دی۔ لیکن تم مجھے ہمیشہ تنگ کرتے ہو۔"

"تھوڑی سی اسے بھی لفٹ دے دو - بڑا اسمارٹ لڑکا ہے"

"شٹ اپ"

"ونڈر فل"

آخر گھنٹے بھر کے بعد میں نے زری کو ساتھ گاڑی میں سوار کروایا۔ اور اس کے دوستوں اور سہیلیوں کی الوداعی آوازوں کے شور میں لے کر کاٹیج کی طرف روانہ ہوگیا۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد ہم منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ سردی آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ کاٹیج نہر کے کنارے بنا ہوا تھا۔ دونوں جانب شیشم کے درخت جھوم رہے تھے۔ نہر میں پانی بہہ رہا تھا۔ زری کاٹیج کا ماحول دیکھ کر بڑی خوش ہوئی۔

"کتنی پرسکون جگہ ہے یہ۔ جی چاہتا ہے ساری عمر یہیں گزار دوں"

ہم کچھ دیر نہر کنارے چہل قدمی کرتے رہے۔ پھر ہم کمرے کے اندر آکر صوفوں پر بیٹھ گئے۔ دیواروں پر فرانسیسی اور اطالوی مصوروں کی تصویریں لگی تھیں۔ فرش پر سرخ قالین بچھا تھا اور درمیان میں مہاگنی کی سیاہ گول میز رکھی کارنس پر گلدانوں میں سفید گلاب مہک رہے تھے۔

میں نے پھل کاٹ کر ٹرے میں رکھے اور ساتھ ہی وائن کی بوتل رکھ دی۔

زری نے پوچھا۔

"یہ وائن کی بوتل کہاں سے لے آئے ہو؟"

میں نے کہا۔

"خریدلی۔ میں نے کہا آج اطالوی طرز کی پک نک منانے ہیں۔"

"تمہیں معلوم ہے اطالوی لوگ وائن کے بغیر کبھی گھر سے باہر نہیں نکلتے"۔

"سچ؟"

"بالکل" ویسے تم زیادہ نہ پینا"۔

"کیوں؟ میری کئی ایک کزن ہیں وہ تو خوب پیتی ہیں اور دو ایک بار تو میں

نے بھی چکھی تھی"

"پھر کیا ہوا؟"

"مجھے تو کچھ نہیں ہوا تھا"

"بہت خوب"

دل ہی دل میں میں نے کہا کہ اب تو خوب مزا رہے گا۔ میرا خیال تھا کہ زری

وائن پر اعتراض کرے گی اور اسے ہاتھ نہیں لگائے گی۔ اور میری ساری اسکیم

پر پانی پھیر دے گی۔ لیکن قدرت نے میری پہلی منزل ہی آسان کردی تھی۔

میں نے دو گلاسوں میں وائن ڈال کر میز پر رکھ دیئے اور خود جیب کاٹ

کر پلیٹ میں رکھنے لگا۔

وائن خوبانیوں کی ہے۔ اس کے ساتھ سیب کھاؤ گی تو مزا دوگنا۔

ہو جائے گا۔"

"میں نے سنا ہے کہ وائن کے ساتھ کچھ نہیں کھانا چاہیے۔"

"وہ بھی تم نے ٹھیک سنا ہے۔ لیکن آج یہ سیب ضرور کھانا۔"

سیب بے حد میٹھا تھا۔ اور مجھے معلوم تھا کہ سیب کھانے سے اس کا نشہ دوگنا ہو جائے گا۔ ہم نے وائن کے گلاس اٹھائے اور دو دو گھونٹ پی گئے۔ کھڑکیوں پر پردے گرے ہوئے تھے۔ اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ ہم کوئی آدھ گھنٹہ تک وہاں بیٹھے آہستہ آہستہ وائن پیتے اور پھل کھاتے رہے۔ اس دوران میں اسی وائن کے تین پیگ پی چکی تھی۔ گالوں پر ہلکا ہلکا پسینہ آگیا تھا اور سر بار بار جھوم سا جاتا تھا۔

"سگریٹ؟ سگریٹ ختم ہو گئے؟"

"نہیں —— یہ لو"

زری سگریٹ سلگانے لگی۔ میں نے لائٹر جلایا۔ سگریٹ اس سے سلگایا نہیں جا رہا تھا۔ میں نے اسے سگریٹ سلگا کر دیا اور اس کے ساتھ ہی ایک اور پیگ بنا کر اسے پلا دیا۔ چوتھے پیگ کے بعد سگریٹ اس کے ہاتھ سے گر پڑا۔

میں اٹھ کر ریڈیو گرام پر انگلش میوزک کا ریکارڈ لگا دیا۔ زری نے ایک قہقہہ لگایا اور دوپٹہ پرے پھینک کر قالین پر آ کر راک اینڈ رول ڈانس

کرنے لگی ۔ میں بھی اس کے ساتھ اوٹ پٹانگ پاؤں مارنے لگا ۔ پھر وہ میری آغوش میں گر پڑی ۔ اس کا سر میری باہنوں میں جھولنے لگا ۔ میں اُسے اٹھا کر صوفے پر لے آیا ۔ صوفے پر لا کر میں نے یکے بعد دیگرے سارے کپڑے اتار دیئے ۔ ایک دو بار اس نے آہستہ سے مزاحمت کی مگر پھر بے سدھ ہو کر پڑ گئی ۔ میں نے اسے اپنے بازوؤں پر ڈال لیا ۔

میرا دوست کیمرہ لیے دوسرے خفیہ کمرے سے اندر آ گیا ۔ اس نے آتے ہی فلش گن سے تصویریں اتارنا شروع کر دیں ۔ ہم نے عریاں حالت میں زری کی کوئی درجن بھر تصویریں لیں ۔ اس کے بعد میں نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا ۔ اور اس کی بھی تصویریں کھینچ لیں ۔ پھر میں نے جلدی جلدی زری کو سارے کپڑے پہنا دیئے اس خیال سے کہ اگر اسے ہوش آ گیا تو برا ہو گا ۔

کوئی گھنٹہ بھر بعد اسے ہوش آیا ۔ تو آنکھیں مل کر اٹھ بیٹھی اور سر پکڑ کر بولی ۔

"اُف یہ مجھے کیا ہو گیا تھا؟"

میں نے اسے پیار کرتے ہوئے کہا ۔

میں تو تمہیں منع کرتا تھا کہ زری زیادہ وائن نہ پیو مگر تم نے میری ایک بھی نہ سنی اب یہ گرم گرم کافی پی لو ۔

زری گرم گرم کافی پینے لگی ۔ پھر اچانک کچھ محسوس کرتے ہوئے بڑے غصے میں بولی ۔

"یہ ـــــ یہ تم نے کیا کیا؟"

میں نے اس کا ہاتھ پیار سے چوم کر کہا۔

"میں خود نشے میں تھا زری! مجھے نہیں معلوم یہ کیا ہو گیا؟"

زری نے دونوں ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔ پھر ہاتھ اٹھائے تو اس کی آنکھیں لال تھیں۔ ناک سکوڑ کر رومال سے آنکھیں صاف کیں۔ اور کہنے لگی۔

میں تمہیں کبھی معاف نہ کروں گی۔

اس میں میرا کوئی قصور نہیں زری! یہ سارا قصور ماحول کا ہے۔

"میں اپنے جذبات اور تمہاری محبت کے ہاتھوں مجبور ہو گیا"۔

زری نے تڑپ کر کہا۔

"تم جھوٹ بولتے ہو۔ تم نے یہ ساری سکیم اسی لئے بنائی تھی۔ میں اب تم سے کبھی نہیں ملوں گی۔ کبھی نہیں ملوں گی"۔

میں نے دل میں کہا۔ تم تو کیا، اب تو تمہارا باپ بھی چاہے تو تمہیں مجھ سے جدا نہیں کر سکتا۔ زری غصے میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

"میں اب جانا چاہتی ہوں"۔

ضرور۔ میں تمہیں تمہاری مرضی کے بغیر کیسے روک سکتا ہوں"۔

میں اسے ساتھ لے کر باہر آ گیا۔ باہر کار تیار کھڑی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ زری جلدی سے اندر بیٹھ گئی۔ میں نے دروازہ بند کیا۔ خود آگے بیٹھا اور گاڑی سٹارٹ کر دی۔

۷

میرے دوست نے فوٹوگرافی کے سارے لوازمات گھر پہ ہی جمع کر رکھے تھے۔ ہم دونوں نے مل کر ڈارک روم میں تصویروں کی ڈویلپنگ کی۔ کل سولہ تصویریں تھیں۔ اور ایسی خوفناک اور عریاں تصویریں کہ اگر زری خود دیکھے تو غش کھا کر گر پڑے۔ میں نے تصویریں اور اس کے نیگٹو تالے میں بند کر دیئے

اب سکیم کا دوسرا حصہ شروع ہوا۔

میں نے زری کو چائے پر بلایا۔ وہ مجھ سے سخت ناراض تھی۔ لیکن اس لالچ میں پھر آگئی کہ شاید میں پھر اسے شاپنگ کرا دوں۔ لیکن اب شاپنگ کا دور گذر گیا تھا۔ ہم شیزان میں آکر بیٹھ گئے۔ میں نے کافی منگوائی۔ زری نے کہا۔

"مجھے تم سے سخت گلا ہے لیکن پھر تمہاری خاطر آگئی ہوں"

میں نے کہا۔

"زری میں تم سے بے حد محبت کرتا ہوں۔ تم میری محبت کا اندازہ نہیں لگا سکتیں۔ میری محبت بے غرض ہے"

زری نے پیسٹری کھاتے ہوئے کہا۔

"میں جانتی ہوں تمہاری بے غرض محبت کو"

"تم اس بات کا خیال نہ کرو زری۔ اگر تمہیں کچھ ہو گیا تو میں اس کی ذمہ داری لینے کو تیار ہوں۔ میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں"

زری بے اختیار ہنس دی۔

"شادی"

"ہاں زری شادی! میں تمہیں اپنے گھر لا کر اپنی زندگی میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں اپنی پیاری بیوی اور اپنے ہونے والے بچوں کی ماں بنانا چاہتا ہوں"

خدا کے لئے یہ دقیانوسی باتیں نہ کرو۔ نہ میں کسی بچے کی ماں بننا چاہتی ہوں۔ اور نہ بیوی بن کر گھر کی چار دیواری میں بند رہنا چاہتی ہوں۔

میں نے زری کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

لیکن تم سکندر سے شادی کر کے ولایت جا رہی ہو۔ کیا تم اس حقیقت

کو جھٹلا سکتی ہو کہ تمہاری اس سے منگنی ہو چکی ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے۔"

"میرے پاس اس کا ثبوت موجود ہے۔"

"کیا ثبوت ہے؟"

"یہ دیکھو۔"

اور میں نے اپنے بٹوے میں سے وہ دعوتی کارڈ نکال کر میز پر رکھ دیا۔ جو زری کے باپ نے اس کی منگنی کے موقع پر خاندان میں تقسیم کرنے کے لئے چھپوائے تھے۔ اب زری کے پاس انکار کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ وہ شرمسار ہونے کی بجائے الٹا مجھ سے بگڑ گئی۔

"تم میری توہین کر رہے ہو۔ اگر منگنی ہو گئی ہے تو کیا ہوا۔ چلو میں سکندر سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ پھر تم مجھے روکنے والے کون ہو۔"

"کیا میں اپنی محبت کی بھیک بھی نہیں مانگ سکتا؟"

"مجھے بھیک مانگنے والوں سے نفرت ہے۔"

"مگر میں تم سے محبت کرتا ہوں۔"

"میں محبت کے نام سے ناآشنا ہوں۔"

"پھر تم کیا سمجھ کر مجھ سے ملتی رہی ہو۔"

"محض دوستی کی بنا پر۔"

"کیا تمہیں دوستی کا بھی لحاظ نہیں ہے"۔

"اچھا تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"مجھ سے شادی کر لو"۔

"ایسا نہیں ہو سکتا"۔

"کیوں"

"میری سکندر سے منگنی ہو چکی ہے"۔

"منگنی ٹوٹ بھی سکتی ہے"۔

"میں نہیں توڑنا چاہتی"۔

"کیوں"۔

"اس لئے کہ میں تم سے شادی نہیں کر سکتی"۔

اب اصل دل کی بات زری کی زبان پر آ گئی تھی۔ میں اسے برانگیخت کر کے اس کے دل کی مزید باتیں باہر نکلوانا چاہتا تھا۔

"کیا اس لئے زری کہ سکندر مجھ سے زیادہ خوبصورت ہے"۔

"مجھ سے زیادہ دولت مند ہے"۔

زری چڑ سی گئی۔

"تم اگر یہی سمجھتے ہو تو یہی سمجھ لو"

"لیکن میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ کیا محبت کی تمہارے دل میں

کوئی قدر نہیں۔

"مجھے اس نام سے نفرت ہے۔"

"تم محبت کے بغیر کیسے زندگی بسر کرو گی؟"

"میں بسر کرنا جانتی ہوں۔"

"لیکن زری اگر میں کہوں کہ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تو پھر تم کیا کہو گی؟"

"میں یہ کہونگی کہ میرے بغیر زندہ رہنے کی مشق ابھی سے شروع کر دو"۔

"اگر میں ایسا نہ کر سکوں تو؟"۔

"تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ اگر اس طرح ہر نوجوان میرے بغیر زندہ نہ رہ سکے تو میں کیا کر سکتی ہوں۔"

"لیکن زری مجھ میں اور دوسرے نوجوانوں میں فرق ہے۔"

"میں ایسا نہیں سمجھتی۔ مجھ پر ہر نوجوان عاشق ہو سکتا ہے۔ اور ہر نوجوان چھ سات ہزار روپیہ بڑی آسانی سے خرچ کر سکتا ہے۔ تم نے اگر کچھ روپیہ مجھ پر خرچ کر دیا ہے۔ تو میں نے بھی تمہیں اپنی رفاقت دی ہے۔ اپنا تبسم دیا ہے۔ میری رفاقت اور تبسم ان روپوں سے زیادہ مہنگا ہے۔"

"مگر میں تم سے بیاہ کرنا چاہتا ہوں زری۔"

"مگر میں ایسا نہیں کر سکتی۔"

اُب مجھے بھی غصہ آگیا۔ میں نے کہا۔

"دنیا کا کوئی مرد تمہیں مجھ سے چھین کر نہیں لے جا سکتا۔"

"تم کیا کر سکتے ہو؟"

"میں تمہاری ہر جگہ شادی رکوا سکتا ہوں۔"

"تم خدا ہو گیا؟"

"خدا کا ایک گناہ گار بندہ ضرور ہوں اور شاید تم نہیں جانتی کہ گنہگار لوگ بہت کچھ کر گذرتے ہیں اور میں بھی بہت کچھ کر سکتا ہوں۔"

"پھر تمہیں جو کرنا ہے کر لو۔ میں تم سے شادی ہرگز ہرگز نہیں کر سکتی۔ میں اب جا رہی ہوں۔"

اتنا کہہ کر زری بڑی تیزی اور غصے سے اٹھی اور فوں فوں کرتی باہر نکل گئی۔ میں اکیلا بیٹھا سگریٹ پیتا رہا اور پھر میں نے بل ادا کیا اور ہوٹل سے باہر آگیا۔

شام کو میں نے اپنے دوست سے مشورہ کیا اور صبح میں نے زری کو چار عریاں قابلِ اعتراض حالت میں تصویریں لفافے میں بند کر کے اسکے ایڈریس پر رجسٹری کرا دی۔ دوسرے ہی روز زری گاڑی میں بیٹھ کر میرے دوست کے دفتر میں آگئی۔ مجھے فوراً بلوایا اور مجھ پر سوار ہو گئی۔

یہ تمہاری ذلالت ہے۔ مجھے خواب میں بھی خیال نہیں آسکتا تھا کہ

"تم اس قدر گھٹیا اور اوچھے ہتھیاروں پر اتر سکتے ہو۔ کیا تم میرے ماں باپ کی عزت سے کھیلنا چاہتے ہو؟"

میں نے کہا۔

میں صرف تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے تمہیں اس روز بھی کہا تھا کہ زری دنیا کا کوئی مرد تمہیں مجھ سے جدا نہیں کر سکتا۔ اور کوئی مرد جسے اس تصویر کی کاپی پہنچ جائے گی۔ تم سے شادی پر کبھی رضامند نہ ہوگا۔ بلکہ اگر شادی ہو چکی ہوگی تو فوراً طلاق دے دیگا۔

زری کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"کیا تم مجھے ذلیل کرنا چاہتے ہو۔ یہ تصویریں میرے خاندان کی عزت خاک میں ملا دیں گی"

"جب تمہاری مجھ سے شادی ہو جائے تو میں تمہارے سامنے ان تصویروں کے نیگیٹو جلا کر راکھ کر دوں گا"

زری نے زمین پر پاؤں مار کر کہا۔

"میں عمر بھر کنواری رہوں گی لیکن تم سے شادی نہ کرونگی"

میں نے زور سے قہقہہ لگایا۔

یہ بھی تمہارا خیال خام ہے۔ میں تمہیں الٹی میٹم دیتا ہوں کہ ان تصویروں کے نتائج ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے والد کو مجبور کرو کہ وہ ایک ماہ کے

اندر اندر سکندر سے منگنی توڑ کر مجھ سے شادی کر دیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو ایک ماہ کے بعد یعنی اگلے ماہ کی یکم کو اِن تصویروں کی ایک ایک کاپی تمہارے باپ اور سکندر کو روانہ کر دی جائے گی۔

" میرا باپ کبھی اس شادی پر راضی نہ ہوگا "

" تو پھر تم ایسا کرو کہ آج ہی میرے ساتھ عدالت میں چل کر سول میرج کر لو۔ ہم کل تمہارے باپ پر شادی ظاہر کر دیں گے۔ ہم انہیں کہہ دیں گے کہ ہماری محبت تھی۔ ہم نے شادی کر لی۔ ہمیں معاف کر دو۔ اور ماں باپ بعد میں معاف کر دیا کرتے ہیں۔"

" میں ایسا ہرگز ہرگز نہیں کر سکتی۔"

" تو پھر مجھے یہ تصویریں مجبوراً تمہارے باپ اور سکندر کو پوسٹ کرنی پڑیں گی۔"

" مجھے سوچنے کی مہلت دو۔"

اب تم سیدھی راہ پر آ رہی ہو۔ میں تمہیں ایک ہفتے کا وقت دیتا ہوں اگر اگلے ہفتے تم نے مجھ سے سول میرج نہ کی تو میں تصویریں پوسٹ کر دوں گا۔

زری نے پرس سنبھالا اور چپکے سے باہر نکل گئی۔ میں بڑی بے تابی سے ہفتے کے گذرنے کا انتظار کرنے لگا۔ میں نے دفتر سے کچھ اور روپیہ نکلوا کر اپنی شادی کی تیاریاں شروع کر دیں کیونکہ مجھے یقین تھا کہ زری مجھ سے ضرور

شادی کرے گی۔

ایک روز پرویز کا فون آیا۔ معلوم ہوا کہ پروین کی شادی ہو رہی ہے۔ میں نے پروین کے لئے ایک نہایت خوبصورت ٹی سیٹ اور سونے کا ہار خریدا۔ شادی کے روز میں نے اسے تحفہ دے دیا۔ پرویز نے کہا

یہ تم نے اتنی رقم کیوں خرچ کی۔

میں نے کہا۔

بہن کی شادی پر تو بھائی جتنا بھی دے کم ہوتا ہے۔

گھر میں بیاہ کا ہنگامہ زوروں پر تھا۔ پروین کی شادی رشتہ داروں میں ہی کسی لڑکے سے ہو رہی تھی۔ برات آچکی تھی۔ میں نے لڑکے کو دیکھا۔ اچھی خاصی شکل صورت کا لڑکا تھا۔ پروین دلہن بنی بیٹھی تھی۔

لڑکیاں ڈھولک پر گیت گا رہی تھیں۔ سو

لنگ آجا پتن جھناں دا

یار لنگ آجا پتن جھناں دا۔

وسے میں پانی بھرنی آں نیناں

بیہڑے نین نہ رمبندے نکلوں۔

یار لنگ آجا پتن جھناں دا۔

گویا پروین کا دولہا دریائے چناب کا پتن عبور کر کے آرہا تھا۔ دریا

کا پتن طے کر کے آنے والے عاشق جانباز شہزادے ہوتے ہیں۔ نسری کا عاشق ہوٹل میں بیٹھا جلی ہوئی کافی پی کر اس کا انتظار کرتا ہے۔ پروین کا دلہا دریاؤں پر سے ہو کر آتا ہے

پروین کا دلہا زندہ باد!

ڈولی جانے لگی۔ پروین رو رہی تھی۔ اس نے اپنی سوجھتی ہوئی لال لال آنکھوں سے سب کو دیکھا۔ مجھے بھی دیکھا اور ڈولی میں بیٹھ گئی۔ برات چلی گئی۔ دل گرفتہ بھائی، سوگوار ماں اور روتی ہوئی بہنیں باقی رہ گئیں۔

۸

پروین ڈولی میں بیٹھ کر اپنے دلہا کے گھر آ گئی۔

اس کے دل میں میری محبت کا گہرا داغ تھا۔ ندا جان نے اس کے بھائی نے پروین کو کسی عزیز شے کا واسطہ دے کر شادی پر راضی کر لیا تھا۔ ورنہ پروین کبھی وہاں شادی نہ کرتی۔ ڈولی میں وہ سارا راستہ روتی رہی۔ آنسو تھمتے ہی نہ تھے۔ سرمہ اس کی آنکھوں سے بہہ رہا تھا۔ آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ ڈولی میں اس کے ساتھ اس کی ایک چھوٹی نند بھی بیٹھی تھی۔ لیکن اسے کیا معلوم تھا۔ کہ پروین کیوں رو رہی ہے۔ وہ تو یہ سمجھ رہی تھی کہ پروین کو ماں باپ کا گھر چھوڑنے کا غم ہے۔ جیسا کہ ہر لڑکی کو ہوا کرتا ہے۔ اس

بے چاری کو کیا علم تھا کہ پروین کے آنسو محبت کے آنسو ہیں۔ اور اس کا غم گھر سے جدا ہونے کا نہیں بلکہ اپنے محبوب سے بچھڑنے کا غم ہے۔

ڈولی بیاہ والے گھر پہنچ گئی۔ باجوں گاجوں کے شور سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ پروین کے سر پر سے کبوتر وار کر اڑائے گئے۔ بڑی دھوم دھام سے دلہا میاں کی بہنوں اور ماں نے اس کا استقبال کیا۔ لیکن پروین کا دل بجھا ہوا تھا۔ دلہا کی بہنیں اور رشتہ دار لڑکیاں اسے ساتھ لے کر کمرے میں آ گئیں۔ اسے دودھ اور شہد پلایا گیا۔ لڑکیاں ڈھولک پر سہاگ کے گیت گانے لگیں۔ گھر بھر میں اک شور مچا تھا۔ محلے کی عورتیں اسے دیکھنے آ رہی تھیں۔ بار بار گھونگھٹ ہٹا کر اس کا چہرہ دیکھا جاتا۔ پروین نے آنکھیں جھکا رکھی تھیں۔ اسے یہ سب کچھ ایک خواب معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے خواب میں کسی شخص سے اس کی شادی کر دی گئی ہے۔ اور ابھی جب اس کی آنکھ کھلے گی تو وہ روز کی طرح اپنے گھر میں بستر پر پڑی ہو گی۔ لیکن پروین کو کیا معلوم کہ بعض خواب سچے ہوتے ہیں۔ اور اس قدر تلخ ہوتے ہیں کہ انسان ان سے بچ کر واپس زندگی میں آنے کی دعائیں مانگتا ہے۔ اسی طرح وہ خواب میں نہیں بلکہ حقیقت کی دنیا میں تھی۔ اس کا محبوب اس سے جدا ہو گیا تھا۔ اور اس کی شادی مرضی کے خلاف رشتہ داروں میں کر دی گئی تھی۔

رات ہو گئی۔ پروین کو زبردستی کھانا کھلایا گیا۔ اس کا دل کچھ بھی کھانے کو نہ چاہ رہا تھا۔ مگر مجبوراً اسے دو چار نوالے لینے پڑے۔ یہ سوچ کر کہ کہیں اس کی محبت کا راز نہ کھل جائے۔ آدھی رات کے قریب دلہن کو ایک سجے سجائے کمرے میں لا کر ایک پلنگ پر بیٹھا دیا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد کمرہ خالی ہو گیا۔ پروین سر جھکائے چپ چاپ بیٹھی رہی۔ اتنے میں دروازہ آہستہ سے کھلا اور پروین کا شوہر اندر آیا۔ وہ پلنگ پر آکر آہستہ سے بیٹھ گیا۔ اور سگریٹ جلا کر بولا۔

"اُمید ہے آپ کو میرا آنا ناگوار نہیں گذرا ہوگا۔"

شوہر نے یہ بات یونہی دل لگی کے خیال سے کہہ دی تھی۔ اُسے کیا معلوم تھا۔ کہ اس کا وہاں آنا حقیقت میں پروین کو سخت ناگوار لگا تھا۔ مگر وہ کچھ نہ بولی۔ شوہر نے اسکا ہاتھ تھام لیا اور پیار سے چوم کر بولا۔

"اب آپ میری زندگی میں بیوی بن کر داخل ہوئی ہیں۔ میں اپنے آپ کو ایک خوش قسمت شوہر تصور کرتا ہوں کہ مجھے آپ ایسی بیوی مل گئی ہیں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کا وفادار بن کر رہوں گا۔ اور امید ہے آپ بھی میری وفادار بن کر رہیں گی۔ ہم گھر گرہستی کی گاڑی کو ساتھ مل کر چلائیں گے۔ اور ہمارے بچے ہم پر فخر کریں۔"

شوہر صاحب اس قسم کی باتیں کئے جا رہے تھے اور پروین کو اس

کی کوئی بات سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔ وہ اس وقت وہاں سے دور ــــ بہت دور ــــ خیال ہی خیال میں کوہ مری والے پہاڑی کاٹیج میں اپنے محبوب کے پاس آتش دان کے ساتھ لگ کر بیٹھی تھی۔ اور وہ اسے کہہ رہا تھا۔

"ہاں پروین! میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں تم سے شادی کروں گا۔"

اور پروین کہہ رہی تھی۔

"اور اگر تم نے مجھ سے بیاہ نہ کیا تو میں مر جاؤں گی یقین کرو میں خودکشی کر لوں گی۔"

اور اس کا محبوب ہنس رہا تھا۔ اور دل میں سوچ رہا تھا۔ کیسی بچوں ایسی باتیں کر رہی ہے۔ بھلا آج تک کسی لڑکی نے شادی کے بعد خودکشی کی ہے۔ یہ محض جذباتی باتیں ہیں۔ جب پروین کی شادی ہو گئی تو وہ سب کچھ بھول جائے گی۔ اور جب بچے ہو گئے تو اسے کبھی خیال بھی نہیں آئے گا۔ کہ اس نے کسی سے خودکشی کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن اس عاشق کو یہ خبر نہ تھی۔ کہ پروین ایک پختہ عزم کی لڑکی ہے۔ اس نے اپنے بھائیوں اور ماں باپ کی خاطر، ان کی عزت اور خاندان کے وقار کی خاطر رشتہ داروں میں شادی کی حامی بھر لی تھی۔ مگر دل میں وہ کچھ اور ہی پروگرام بنائے ہوئے تھی۔

شوہر اب دلہن کا ہاتھ سہلا رہا تھا۔ اور کہہ رہا تھا۔

"میں نے تمہیں کئی بار دیکھا ہے۔ تمہیں یاد ہے جب میں کبھی کبھی تمہارے گھر جاتا تھا تو تم مجھ سے کھل کر بات نہیں کیا کرتی تھیں۔ آخر کیوں ؟ کیا تم مجھ سے شرماتی تھیں۔ کیا تمہیں معلوم تھا کہ ایک دن تم میری بیوی بن کر میرے گھر آؤ گی۔ کہو پروین ؟ تم بولتی کیوں نہیں ؟"

پروین خاموش تھی۔ اپنے شوہر کے ہر سوال پر خاموش تھی۔ اور کسی دوسرے شخص کی ہر بات کا جواب دے رہی تھی۔ وہ کوہ مری والے کاٹیج کے آتش دان کے پاس کھڑی تھی اور کہہ رہی تھی۔

"میری زندگی صرف تمہارے لئے ہے اور موت بھی تمہارے لئے اور تمہاری خاطر ہو گی۔"

"ایسی باتیں نہیں کیا کرتے پروین! محبت انسان کو زندہ رہنا سکھاتی ہے۔ محبت میں خود کشی کرنا گناہ ہے۔ بلکہ محبت میں تو انسان موت پر بھی فتح حاصل کر لیتا ہے۔"

پروین کے ذہن میں اپنے محبوب کی آواز گونج رہی تھی۔ اسے اور کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اور اس کا شوہر اسکا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

اور میں تو چوری چھپے تم سے پیار بھی کرنے لگا تھا۔ جب میں تمہارے

گھورتا اور تم مجھ سے آنکھ چرالیتیں تو میرا دل دھڑکنے لگتا تھا۔ اور جی چاہتا کہ فوراً تمہارے سامنے جاکر اپنی محبت کا اعتراف کرلوں اور تمہارا ہاتھ تھام کر کہوں کہ پروین میں تم سے پیار کرتا ہوں۔ اور ساری زندگی تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ مگر مجھ میں اتنی جرأت ہی پیدا نہ ہوتی تھی۔ اب خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے میری دیرینہ آرزو پوری کردی۔ اور تم دلہن کے روپ میں میری جیون ساتھی بن کر میری زندگی میں آگئی ہو۔ میں اپنی قسمت پر جس قدر بھی ناز کروں کم ہے۔

اور اس کے شوہر نے پروین کا ہاتھ چوم لیا۔

دن چڑھ آیا۔ سہاگ رات گذر گئی۔ پروین کے لئے وہ قیامت کی پہلی رات تھی اور اس کے شوہر کے لئے جنت کی پہلی شام تھی دوسرے روز وہ اپنے خاوند کے ساتھ اپنے ماں باپ کے گھر آگئی۔ گھر میں اس کی بہنوں اور بھائیوں نے اس کا خوب سواگت کیا۔ مگر سب نے محسوس کیا کہ پروین کے چہرے پر رونق نہیں ہے۔ وہ کچھ بجھی بجھی سی ہے۔ جتنا اس کا شوہر خوش ہے اتنی خوش پروین نہیں ہے۔

"پینو! کیا بات ہے۔ تم اداس کیوں ہو؟" شادی کے دوسرے روز تو دلہنوں کے چہرے کنول پھول کی طرح کھلے ہوئے ہوتے ہیں لیکن تم ہو کہ کیسر کی طرح زرد ہو رہی ہو۔"

پروین نے آبِ دیدہ، گیلی آنکھوں سے اپنی بڑی بہن کی طرف دیکھا اور اس کی پلکوں پر سے آنسوؤں کے موتی ٹوٹ کر گر پڑے۔ زینت نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ پروین ہچکیاں لے کر رونے لگی۔

میں وہاں کیسے خوش رہ سکتی ہوں باجی؟ میرے لئے اس گھر میں خوشی کی کونسی شئے ہو سکتی ہے؟ میری روح تو کسی اور کے ہاں بھٹک رہی ہے۔ اور جسم شوہر کے پاس پڑا ہے۔

زینت نے پروین کو پیار کیا۔ وہ اس کے راز سے واقف تھی۔ اس نے پروین کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیر کر کہا۔

"اب تمہیں اسے بھول جانا چاہیے پروین! اب تمہاری شادی ہو گئی ہے۔ تم نے اپنی نئی زندگی شروع کی ہے۔"

"کیسے بھول جاؤں؟ انہیں کیسے بھول جاؤں۔ اپنی پہلی محبت کو، اپنے پہلے پیار کو کیسے بھول جاؤں۔؟ میں زندہ رہنا بھول سکتی ہوں مگر اپنی محبت کو کبھی نہیں بھول سکتی۔ یہ چیز میرے اختیار سے باہر ہے۔"

زینت نے پروین کو بہت سمجھایا۔ لیکن پروین کی آنکھوں سے آنسو تھمنے کا نام ہی نہیں لیتے تھے۔ زینت کو پورا یقین ہو گیا کہ پروین کے دل میں اپنے محبوب کی محبت پوری طرح اتر چکی ہے اور اب

اس نقش کو مٹانا اس کے بس میں نہیں - پھر بھی اوپر سے اس نے اپنی بہن کو تسلی دی - اور یہی کہا کہ اب پرانی محبت کو بھلا دینے میں ہی اس کی اور سارے خاندان کی بھلائی ہے -

وہ رات پروین نے اپنے ماں باپ کے گھر میں بسر کی - پروین کی اداسی کو اس کے بھائی نے بھی محسوس کیا - چونکہ وہ تمام حالات سے باخبر تھا - اس لئے اس نے پروین سے اس کی اداسی کی وجہ پوچھنے کی ضرورت محسوس نہ کی - اس کے باوجود اسے اپنی بہن کی طرف سے بڑا فکر ہو گیا - کیونکہ اس کی بہن نے دوسری جگہ شادی تو کر لی تھی لیکن اس کے دل کا زخم بھرنے کی بجائے کھل گیا تھا - جس کی دوا نہ اس کی بہنوں کے پاس تھی اور نہ بھائیوں کے پاس - اپنی تمام تر محبت اور ہمدردیوں کے باوجود وہ اپنی بہن کے لئے کچھ بھی نہ کر سکتے تھے - پروین کے بھائی کو معلوم تھا کہ پروین اپنے شوہر سے، اپنی نئی زندگی سے ناخوش ہے - اور اگر اس کا علاج نہ کیا گیا تو وہ زندہ نہ رہے گی - مگر وہ کر ہی کیا سکتے تھے - اس کے باوجود اس کا بھائی پریشان ضرور ہو گیا -

رات بسر کرنے کے بعد پروین اپنے خاوند کے ساتھ واپس اپنے گھر چلی گئی - خاوند پروین پر جان فدا کرتا تھا - وہ حقیقت جب اس

سے بے حد پیار کرنے لگا تھا۔ وہ جب پروین کو اداس دیکھتا تو فکر مند ہو کر اسے پوچھتا۔

"پروین! میں نے تمہارے قدموں پر دنیا جہان کی نعمتیں ڈھیر کر دی ہیں لیکن تمہارا چہرہ اداس ہے۔ مجھے بتاؤ تمہیں کون دکھ اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔ کیا تم مجھ سے شادی کر کے خوش نہیں ہو؟"

پروین بھلا اسے کیا جواب دے سکتی تھی۔ وہ اپنے خاوند سے ناخوش نہیں تھی۔ اسے یہ دکھ نہیں تھا کہ اس کا بیاہ ایک نامحرم سے ہو گیا ہے۔ بلکہ یہ غم تھا کہ اس کی شادی اس شخص سے نہیں ہو سکی جس سے وہ محبت کرتی تھی۔ اس میں اس کے خاوند کا کوئی قصور نہیں تھا۔ قصور اگر تھا تو اس کے محبوب کا تھا۔ جس نے اس کی محبت کو ٹھکرا دیا تھا۔ اور اس سے شادی نہیں کی تھی۔

پروین کے ذہن میں خیالات کے بگولے چکر لگانے لگتے۔ اور اسکا ذہن بار بار تھک کر نڈھال ہو جاتا۔ دوسرے روز اسکا شوہر اسے ساتھ لے کر سیر کو نکل گیا۔ پہلے وہ چڑیا گھر گئے۔ پھر انہوں نے کوئی فلم دیکھی۔ لیکن پروین کا چہرہ پریشان اور غمگین ہی رہا۔ اس کے بعد اسکا خاوند اسے لے کر شیزان ہوٹل میں آگیا۔ وہ دونوں اوپر گیلری میں جا کر بیٹھ گئے۔ ابھی انہوں نے چائے منگوائی ہی تھی کہ اچانک پروین نے

دیکھا کہ اس کا محبوب (یعنی میں) اپنی محبوبہ کے ساتھ گیلری میں داخل ہوا اور ایک طرف بیٹھ گیا۔

دراصل میں اس روز زری کو لے کر شیزان گیا تھا۔ اور یقین کریں کہ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ وہاں پروین بھی اپنے خاوند کے ساتھ بیٹھی ہوگی تو میں وہاں کبھی نہ جاتا۔

پروین نے زری کو دیکھا تو اس کا دل جل کر راکھ ہو گیا۔ اسکا ذہن ماؤف سا ہونے لگا۔ ایک بار تو اسے چکر آ گیا۔ اور اس نے جلدی سے پانی پی لیا۔ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے محبوب کو ایک دوسری عورت کیساتھ بیٹھا دیکھ رہی تھی۔ اس کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ مگر وہ سوائے صبر کرنے کے اور کچھ نہ کر سکتی تھی۔ ہماری عورتیں دنیا کی سب سے بڑی صبر کرنے والی عورتیں ہیں۔ یورپ میں ایک عورت پھاوڑا لے کر دن بھر بازار کی برف صاف کر سکتی ہے لیکن وہ اپنے عاشق کے ساتھ بیٹھی دوسری عورت کو ایک پل کے لئے برداشت نہیں کر سکتی۔ لیکن ہماری پاک وہند کی عورتیں بڑے سے بڑا صبر کر سکتی ہیں۔ اس معاملے میں ہماری عورتوں کا جواب شاید دنیا بھر میں کہیں بھی نہیں ہے

برداشت کرنے کو پروین برداشت تو کر گئی۔ مگر اس کا دل خون

ہو کر رہ گیا۔ اسے اس قدر صدمہ ہوا کہ معلوم ہوا سارا شہر اس کے ارد گرد گھوم رہا ہے۔ اس نے جلدی جلدی چائے پی اور خاوند سے کہا۔
"یہاں سے چلئے۔ میرا دل یہاں گھبرا رہا ہے۔"

خاوند جو اپنی بیوی کے لئے بچھا جا رہا تھا۔ پریشان ہو گیا۔ اس نے جلدی سے بل ادا کیا اور پروین کو ساتھ لے کر ہوٹل سے باہر آ گیا۔

شام کو پروین کو بخار ہو گیا۔ سب گھر والے اس کی تیمارداری کرنے لگے۔ خاوند نے دو تین ڈاکٹروں کو بلا لیا۔ انہوں نے دوا لکھ دی۔ اور چلے گئے۔ کوئی رات کے گیارہ بجے پروین نے بستر پر نیم دراز ہو کر اپنے محبوب کو خط لکھا۔ یہ اس کا اپنے محبوب کے نام پہلا اور آخری خط تھا۔

اس نے لکھا۔

"میرے اجنبی محبوب!

شاید زندگی میں پہلی اور آخری بار تمہیں خط لکھ رہی ہوں۔ اس کے بعد نہ تمہیں خط لکھوں گی اور نہ تم میری شکل ہی دیکھ سکو گے۔ ابھی نے تمہیں اس لئے لکھا کہ تم نے ہمیشہ مجھ سے اجنبی مردوں کی طرح سلوک کیا۔ میں تمہارے لئے ہمیشہ اجنبی ہی رہی۔ اس کے باوجود میں نے پہلی نظر میں تم سے محبت کی۔ اور زندگی بھر تم سے محبت

کرتی رہی۔ اور مرنے کے بعد بھی میری روح آسمانوں پر تمہارا ہی انتظار کرے گی۔ کاش تم نے میری محبت کی قدر کی ہوتی۔ کاش! تم نے میری محبت کے جذبے کو ایک پل کے لیے بھی سمجھنے کی کوشش کی ہوتی۔ میں نے اپنے دامن کے سارے سچے موتی، لعل تمہارے قدموں پر ڈھیر کر دیئے۔ لیکن تم نے انہیں پتھر کے ٹکڑے سمجھ کر ٹھکرا دیا۔ میں نے اپنے جوڑے کے بہترین پھول اتار کر تمہارے چرنوں میں ارپن کئے لیکن تم ان پر پاؤں رکھ کر، انہیں کچل کر نکل گئے میں نے تمہاری طرف مسرت اور خلوص کا ہاتھ بڑھایا اور تم نے میرے ہاتھ کو یوں جھٹک دیا جیسے وہ کسی دشمن کا ہاتھ ہو۔ پھر بھی میں نے اُف نہ کی۔ شکایت یا گلہ شکوہ نہ کیا۔ میں اسی بات سے خوش ہو گئی کہ چلو تم نے میرے موتی اٹھا کر جیب میں نہیں رکھے نہ سہی۔ انہیں ٹھکرایا تو ہے۔ ان موتیوں کو تمہاری ٹھوکر تو لگی ہے۔ تم نے میرے جوڑے کے پھولوں کو اٹھا کر سینے سے نہیں لگایا نہ سہی، لیکن کم از کم تم نے ان پر اپنا پاؤں تو رکھ دیا۔ میرے جوڑے کے پھولوں کے اتنے بھاگ تو ہوئے کہ انہیں تمہارے چرنوں کی دھول ہی مل گئی۔ میرے لئے تو تمہارے چرنوں کی دھول ہی بہت ہے۔ میں تو اسے بھی روشنی کا غبار سمجھتی ہوں۔

لیکن بات یہیں پر ہی ختم نہیں ہو جاتی ۔ تم نے نہ صرف یہ کہ میری محبت کو ٹھکرایا بلکہ میرے سامنے ایک دوسری لڑکی کو لے کر آ گئے اور اس سے محبت کی پینگیں بڑھانی شروع کر دیں ۔ کاش آج کا دن کبھی طلوع نہ ہوتا ۔ کاش! آج کے روز سورج دیوتا بادلوں ہی میں چھپا رہتا ۔ اور اپنی روشنی نہ پھیلاتا ۔ کاش! میں تمہیں شیزان میں زری کے ساتھ کبھی نہ دیکھتی ۔ میں جانتی ہوں تم زری سے محبت کرتے ہو تم اس لڑکی کو کوہ مری کے پہاڑ پر ملے تھے ۔ تم اس لڑکی سے پیار کرتے ہو اور اسی لڑکی کی خاطر تم نے میری محبت کو ٹھکرایا ہے ۔ چلو اپنے اپنے بھاگ ہوتے ہیں ۔ اپنی اپنی قسمت ہوتی ہے ۔ میری قسمت میں ناکامی اور نامرادی ہی لکھی تھی ۔ گلیوں کی خاک اڑانا ہی لکھی تھی جب تقدیر نے میری تقدیر میں تم سے جدائی اور محبت کا گہرا گھاؤ کھانا لکھ دیا تو پھر اسے کون مٹا سکتا ہے بھائی جان نے ایک بار عمر خیام کی ایک فارسی رباعی کا مطلب سمجھایا تھا جو یوں تھا ۔ کہ ــــ لکھنے والا ہاتھ لکھتا چلا جاتا ہے اور لکھی ہوئی تقدیر آگے بڑھتی چلی جاتی ہے ۔ ہوتی ہو کر رہتی ہے ۔ دنیا کے سمندروں کا سارا پانی بھی اگر چاہے تو تقدیر کے لکھے کی ایک سطر نہیں مٹا سکتا ــــ "

تب میں نے اس رباعی کو کچھ نہ سمجھا تھا ۔ میں نے ہنس کر کہا تھا کہ

انسان تو اپنی تقدیر کا مالک ہوتا ہے - وہ جیسی چاہے اپنے لئے تقدیر بنا سکتا ہے - لیکن اب معلوم ہوا کہ وہ میری بھول تھی - ہونی کا ہاتھ بڑا بیرحم ہوتا ہے - وہ تو پتھر کے قلم سے پتھر پر لکھتی ہے - اور پتھر توڑا جا سکتا ہے لیکن اس پر لکھے ہوئے کو مٹایا نہیں جا سکتا - چنانچہ اب جبکہ تقدیر کا قلم چل چکا ہے - ہونی کے ہاتھ نے پتھر پر میری قسمت کی تباہیاں لکھ دی ہیں تو میں اس لکھے کو نہیں مٹا سکتی - مگر پتھر ضرور توڑ سکتی ہوں - اس لئے ہو سکتا ہے کہ جب تمہیں میرا یہ خط ملے تو میں اس دنیا سے رخصت ہو چکی ہوں -

میرا خیال ہے تمہیں میری موت کا دکھ ضرور ہو گا بس میرے لئے یہی سب سے بڑا انعام ہو گا - میں زندہ رہ کر تمہیں حاصل نہیں کر سکی لیکن مر کر تمہاری تھوڑی بہت توجہ اور ہمدردی ضرور حاصل کر لوں گی میں نے اسی لئے موت کو اپنے لئے چن لیا ہے کہ یہی وہ جگہ ہے جہاں میں تمہاری محبت کا تھوڑا سا حصہ وصول کر سکتی ہوں - یہی وہ دستر خوان ہے جہاں مجھے تمہاری محبت کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا مل سکتا ہے - چنانچہ میں مر رہی ہوں - خودکشی کر رہی ہوں - موت ان لوگوں کے لئے تکلیف دہ ہوتی ہے - جن کی زندگی بے حد اچھی اور کامیاب ہوتی ہے - لیکن جس شخص کی زندگی موت سے بدتر

ہو وہ تو موت کو ایک نعمت سمجھ کر اپنے گلے سے لگائے گا۔

موت سے وہ لوگ ڈرتے ہیں اور بھیانک سمجھتے ہیں۔ جن کی زندگی محبت کرنے والوں سے بھری ہوتی ہے۔ جنہیں زندگی کے ہر موڑ پر، ہر گھر کی چوکھٹ پر پیار کرنے والے، پھولوں کے ہار لیے ملتے ہیں۔ وہ لوگ موت سے کیا ڈریں گے جن کی زندگیوں میں ہر چوک میں لوگ پتھر لئے کھڑے ہوں اور انتظار کر رہے ہوں کہ کب وہ آئیں اور ان پر پتھروں کی بارش کی جائے۔ ان پر تیر برسائے جائیں۔ میں تو اپنی محبت کی لاش کو بازوؤں پر اٹھائے جگہ جگہ، گلی گلی، در در پھر رہی ہوں۔ اور کوئی ایسا پیار بھرا ہاتھ میری طرف نہیں بڑھا جو بڑی شفقت کے ساتھ میری آنکھوں سے بہتے آنسو پونچھ ڈالے اور کہے۔ پروین! تمہیں کونسا دکھ ہے؟ یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔ تم اپنی مردہ محبت کی لاش کو لیے در بدر کیوں پھر رہی ہو؟ تم پر یہ ظلم کس نے کر دیا؟ تم تو اتنی پیاری، اتنی نیک دل ہو۔ پھر یہ حالت کس نے بنا دی؟ وہ کون پتھر دل انسان ہے جس نے تم ایسی پیاری لڑکی کی زندگی کو جہنم کا نمونہ بنا دیا۔ تمہارے پاؤں چھلنی کر دیئے تمہاری آنکھوں میں آنسو بھر دیئے۔ تمہارے ہونٹوں پر آہیں بکھیر دیں تمہارے راستوں کو کانٹوں سے بھر دیا۔ تمہیں اتنی تیز دھوپ میں ننگے

پاؤں شہر کی تپتی ویران اور سنسان گلیوں میں دھکیل دیا؟ کس نردئی نے
تم پر اپنے گھر کے دروازے بند کر دیئے ہے؟

میرا چہرہ زرد ہے۔ آنکھوں میں آنسوؤں کی جھڑی ہے۔ ہونٹوں
پر سرد آہیں ہیں۔ پاؤں سے خون بہہ رہا ہے۔ اور میں شہر کی سنگدل
گلیوں میں دیوانہ وار پھر رہی ہوں۔ میں ہر گھر کے دوار پر دستک دیتی
ہوں۔ لیکن کسی گھر کا دروازہ میرے لئے نہیں کھلتا۔ لوگوں نے مجھے
کلنکنی اور کوڑھی سمجھ کر اپنے اپنے گھروں کے دروازے بند کر لیتے
ہیں۔ میں اپنی محبت کا زخم کھائے۔ اپنے بچے کی لاش اٹھائے شہر
میں اکیلی پھر رہی ہوں اور کوئی مجھے اپنے پاس نہیں بلاتا۔ میری زندگی
موت سے بدتر ہو رہی ہے۔ جس شخص سے محبت کرتی ہوں۔ جس کو
اپنا بھگوان جانتی ہوں۔ اس کا مکھڑا نظر نہیں آتا۔ اور جس شخص کو کبھی نہیں
دیکھنا چاہتی وہ ہر وقت سائے کی طرح میرے ساتھ ساتھ رہتا ہے
وہ میری زندگی کا مالک بن گیا ہے۔

ایسی حالت میں تم ہی کہو کہ میں اگر خودکشی نہ کروں تو کیا کروں؟
اگر تم میری جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟ کیا تم زندہ رہ سکتے تھے؟ مجھے تو
موت ماتا کے روپ میں نظر آ رہی ہے۔ محبت کرنے والی
ماں —— جو اپنے بازوؤں کھولے مجھے اپنی طرف بلا رہی ہے

مجھے اب صرف اسی ماتا کی گود میں سکون ملے گا۔ موت ہی میرے زخموں پر مرہم رکھے گی۔ موت ہی میرے دکھوں کا علاج کرے گی۔

مرتے سمے اگر مجھے دُکھ ہوگا تو یہی کہ کاش تم میرے پاس ہوتے میرے سامنے ہوتے۔ اور میں تمہارا ہاتھ پکڑ کر اپنا دوسرا ہاتھ موت کے حوالے کرتی اور لوگوں سے کہتی کہ لوگو! گواہ رہنا ہیں نے اپنی محبت کے لئے، اپنے پریمی کے لئے جان دی ہے۔ لیکن جانتی ہوں ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم میرے پاس نہیں آ سکتے۔ ہاں مرنے کے بعد میں ضرور تمہارے پاس آسکتی ہوں۔ میری روح تمہارے اوپر اپنا چھتر پھیلائے رکھے گی۔ وہ تمہاری حفاظت کرے گی اور تمہیں کبھی کوئی تکلیف نہ ہونے دے گی۔ کبھی تمہیں سورج کی تیز دھوپ نہ لگنے دے گی۔

یہ میری اس دنیا میں آخری رات ہے اس دنیا میں تم زندہ رہو گے لڑکیوں سے محبت کرو گے۔ شادی کرو گے۔ ہنسو گے۔ کھیلو گے مگر ہم نہ ہوں گے۔ ہم تمہیں یاد بھی نہ آئیں گے۔ پھر بھی ہماری روح تمہیں آسمانوں پر یاد کیا کرے گی۔ اور جھک کر اپنی بھیگی پلکوں سے تمہیں اس دنیا میں دوستوں کے ساتھ ہنسنے، گاتے، گھومتے پھرتے دیکھا کرےگی

یہ میری آخری رات ہے۔ کل کا سورج میری قبر پر طلوع ہوگا۔ کل کی دھوپ جس وقت کھلے گی تو میں قبر کی آغوش میں ہزاروں من مٹی

کے نیچے دفن ہوں گی۔ لیکن میری روح دھوپ کے ذرے ذرے میں بے شمار آنکھیں بن کر تمہیں دیکھ رہی ہوگی۔ تمہارے درشن کر رہی ہوگی۔

اچھا اب خدا حافظ! ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خدا حافظ۔ آخری بار صرف اتنا کہوں گی کہ تم میری قبر پر آکر رونا نہیں۔ اس طرح تمہاری بدنامی ہو گی۔ لوگ کہیں گے کہ تم دوسرے آدمی کی بیوی سے محبت کرتے تھے تم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے سے پہلے "مثنوی زہر عشق" کے دو چار اشعار سنائے جاتی ہوں۔ ان شعروں میں میری روح تڑپ رہی ہے۔ سنو گے؟

پھل اٹھایا نہ زندگانی کا
نہ ملا کچھ مزا جوانی کا

دل میں لے کر تمہاری یاد چلے
باغِ عالم سے نامراد چلے

جب جنازہ مرا عزیز اٹھائیں
آپ بیٹھے نہ واں اشک بہائیں

آپ کاندھا نہ دیجئے گا مجھے۔
سب میں رسوا نہ کیجئے گا مجھے۔

کبھی آ جائے گر تمہارا دھیان
جانتا ہم پہ ہو گئی قربان
غنچۂ دل میرا کھلا جانا
پھول تربت پہ دو چڑھا جانا

"صرف ایک رات کی مہمان"
"ہمیشہ تمہاری"
"پروین"

خط لکھ کر پروین نے لفافے میں بند کیا - اس پر اپنے پریمی کا پتہ لکھا اور آہستہ سے پلنگ پر سے اٹھی - چادر اوڑھی اور چپکے سے مکان سے باہر نکل گئی - ان کے مکان کے بالکل سامنے ڈاک خانے والوں کا ایک لیٹر بکس لگا تھا - پروین نے خط لیٹر بکس میں ڈالا اور الٹے پاؤں واپس گھر میں داخل ہو کر اپنے کمرے میں آ کر بستر پر نیم دراز ہو گئی - ایک منٹ کے لئے اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اپنی ساری پچھلی زندگی کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا - پھر اس نے دیکھا کہ اس کی لاش پلنگ پر پڑی ہے اور اس کا شوہر، ماں، باپ، بہن، بھائی اس کے ارد گرد کھڑے زار و قطار رو رہے ہیں - اسے آوازیں دے دے کر بلا رہے ہیں -

لیکن وہ ان کی پہنچ سے بہت دور ۔۔۔ بہت دور نکل کر جا چکی ہے
پروین نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں۔
اس کی میز پر خواب آور گولیوں کی شیشی پڑی تھی۔ یہ گولیاں
ڈاکٹر اس لئے چھوڑ گیا تھا کہ اگر رات کو نیند نہ آئے تو اس کی ایک
گولی کھالی جائے۔ پروین نے شیشی کی طرف دیکھا۔ اسے یوں لگا جیسے
شیشی کے اندر پھولوں سے بھرا ہوا ایک ریشمی بستر لگا ہے۔ اور پریاں
اس کے اوپر اڑ رہی ہیں۔ اور اسے اپنی طرف بلا رہی ہیں۔ پروین نے
شیشی اپنے ہاتھ میں تھام لی۔ اس نے اس کا ڈھکنا کھول کر ساری
گولیاں باہر نکال کر ہتھیلی پر رکھ لیں۔ ایک پل کے لئے ان گولیوں کو
ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہی۔ پھر ایک سیکنڈ میں اس نے ساری کی
ساری گولیاں منہ میں ڈالیں اور پانی کا پورا گلاس حلق میں انڈھیل لیا۔
ساری گولیاں پروین کے معدے میں چلی گئیں۔
پروین نے گلاس میز پر رکھا اور پلنگ پر لیٹ کر چادر منہ کے
اوپر ڈال لی۔ اور موت کا انتظار کرنے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ اسے
بڑی تکلیف ہو گی۔ لیکن اس پر غنودگی سی طاری ہونے لگی وہ سمجھ گئی
کہ یہ موت کی غنودگی ہے۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اس نے یہ کیا کر دیا
ہے۔ زندگی اتنی معمولی چیز تو نہیں ہے کہ وہ اسے اپنے ہاتھوں

ایک ہی پل میں ختم کر دے۔ جیون کی سونے کی زنجیر اتنی سستی نہیں تھی کہ اسے ایک ہی جھٹکے سے اپنے ہی ہاتھوں توڑ دیا جائے۔ اس خیال کے ساتھ ہی پروین کے دل میں زندہ رہنے کی شدید خواہش تڑپ اٹھی۔ اس نے جلدی سے ہاتھ چادر سے باہر نکال کر خالی گلاس کو پکڑنے کی کوشش کی۔ اس کا ہاتھ لرز کر رہ گیا۔ اسے یوں لگا جیسے وہ کسی دوسری عورت کا ہاتھ ہے اور اس کا کہا نہیں مان رہا۔

اب اس کے جسم میں سے سکت دور ہوتی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب قسم کے گھاؤنے سائے رینگنے لگے تھے۔ اس کے کانوں میں سمندر کی لہروں کی آوازیں ابھرنے لگیں۔ پھر اس نے اپنی بڑی بہن کی آواز سنی جیسے وہ اسے بلا رہی ہے۔

پروین! پروین! پروین!!

مگر پروین جواب دینے کی زبردست خواہش کے باوجود بول نہ سکی۔ اس کے ہونٹوں نے کھلنے سے انکار کر دیا۔ اس کے ہونٹ پتھر کے ٹکڑوں کی طرح ٹھنڈے اور سخت ہو گئے تھے۔ اس کے بعد وہ گہری نیند ——— موت کی کبھی ختم نہ ہونے والی نیند میں ڈوب گئی۔ پھر جو کچھ ہوا اس کی پروین کو کوئی خبر نہ ہو سکی۔

پھر یوں ہوا کہ دن چڑھ گیا اور پروین چادر اوڑھے سوئی رہی۔

اس کے خاوند نے اِس لئے نہ جگایا کہ کہیں اس کی نیند اچاٹ نہ ہو جائے لیکن صبح کے آٹھ بج گئے اور پروین اسی طرح سوئی رہی تو اسے فکر ہوا۔ اس نے پروین کو ہلایا۔

"پروین! اٹھو پروین دن نکل آیا ہے۔"

لیکن پروین نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کے خاوند نے چادر چہرے پر سے سرکائی تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ پروین کے چہرے پر موت کی زردی تھی۔ اچانک اس کی نظر گولیوں کی خالی شیشی پر پڑ گئی۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ وہ پروین سے لپٹ گیا اور بچوں کی طرح رونے لگا۔

تھوڑی دیر بعد سارے گھر میں کہرام مچا تھا۔ ہر شخص رو رہا تھا۔ پروین کے بہن بھائی بین کر رہے تھے۔ پرویز کی حالت بڑی خراب تھی۔ کیونکہ وہ خود کو پروین کی موت کا ذمہ دار سمجھ رہا تھا۔ بہنیں دیوار سے ٹکریں مار رہی تھیں۔ لیکن اب کچھ نہ ہو سکتا تھا۔ چڑیا اڑ گئی تھی اور پنجرہ خالی رہ گیا تھا۔

پروین کی موت کی مجھے پہلے خبر ملی اور خط دوسرے روز ملا۔ میں خود اس کی موت کا سن کر سکتے میں آ گیا۔ مجھے یقین نہیں آتا تھا کہ اتنی بھولی بھالی لڑکی ایسا سنگین قدم بھی اٹھا سکتی ہے۔ پھر

جب اس کا خط ملا تو حقیقت حال میرے سامنے آگئی۔ پروین نے میری محبت میں ناکام ہو کر خودکشی کی تھی۔

میں نے اس کا درد بھرا خط کئی بار پڑھا اور مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی۔ کیونکہ محض میری خودغرضی کی وجہ سے پروین کی جان گئی تھی۔ میں بڑی آسانی سے پروین سے بیاہ کر کے ایک ہنسی خوشی کی سادہ اور پرسکون زندگی بسر کر سکتا تھا۔ لیکن مجھ پر تو دولت، کار، بنگلہ اور بہتر سے بہتر امیرانہ زندگی کا بھوت سوار تھا۔ میں تو دولت سمیٹنے کے لئے زری سے بیاہ کرنے کی فکر میں تھا۔ میں بھلا پروین سے کیسے شادی کر سکتا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ پروین محض میری وجہ سے مری تھی اور خدا اس گناہ کے لئے مجھے کبھی معاف نہیں کرے گا۔ میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا رہا اور میں اسکی ملامت سہتا رہا۔

پروین کو قبر میں اتار دیا گیا۔ اسکی قبر پر میں نے گیندے کے پھولوں کی چادر چڑھائی۔ یہ پھول دو روز بعد مرجھا گئے اور چوتھے روز خشک ہو کر ہوا میں پتی پتی ہو کر اڑ گئے اور یوں لگا جیسے پروین کبھی اس دنیا میں نہیں تھی۔

۹

میں اس احساس کو کبھی نہیں جھٹلا سکتا کہ پروین نے میری محبت میں خود کشی کی ہے۔ اگر میں اس سے شادی کر لیتا تو وہ کبھی نہ مرتی ہمارے ملک کی لڑکیاں بڑی سے بڑی قربانی کر گذرتی ہیں۔ دیکھنے میں دھان پان معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن وقت آنے پر چٹیان کی طرح ڈٹ جاتی ہیں۔ پروین سے میں نے بے وفائی کی۔ وہ یہ غم برداشت نہ کر سکی۔ شادی سے انکار اس نے اس لئے نہ کیا کہ وہ ماں باپ کی عزت کرتی تھی۔ وہ ان کے سامنے سر نہ اٹھا سکتی تھی۔ شادی ماں باپ کی مرضی کے مطابق کی اور وہاں جاکر خود کشی کر لی۔ دوسرے کے گھر جاکر موت کا جام پی لیا۔ اب لوگ یہی سمجھیں گے کہ شاید

اس کی خاوند سے نہ بن سکی تھی۔ یہ کوئی نہیں سوچ سکتا کہ اس کی شادی اس کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی۔ یا وہ کسی دوسرے سے محبت کرتی تھی۔

مر کر پروین نے اپنی محبت اور ماں باپ کی عزت کی لاج رکھ لی پروین امر ہے۔ پروین کی قربانی ہمیشہ زندہ رہے گی۔ زندگی، موت کے باوجود رواں دواں رہتی ہے۔ میں نے پروین کو بھلا کر زری کا تعاقب شروع کر دیا۔ اس نے مجھ سے ایک ہفتے کی مہلت مانگی تھی۔ ہفتہ ختم ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے فون کیا کہ وہ شام کو شیزان میں آ رہی ہے۔

میں بڑا خوش ہوا کیونکہ میں جانتا تھا کہ زری نے اپنی ہار مان لی ہے اس نے ہتھیار پھینک دیئے ہیں۔ وہ میرے پنجے میں پوری طرح پھنس گئی تھی۔ میرے جال نے اسے چاروں طرف سے اس طرح سے جکڑ لیا تھا۔ کہ وہ کوشش کے باوجود اس جال سے نہیں نکل سکتی تھی میں وقت پر وہاں پہنچ گیا۔ زری اندر آئی۔ وہ بجھی بجھی سی تھی۔ اس کے چہرے کی دلکشی غائب ہو چکی تھی۔ مجھے اس پر ترس آیا۔ پھر مجھے ہزاروں روپے کے غبن اور اپنے مستقبل کا خیال آ گیا۔ وہ میرے پاس چپکے سے بیٹھ گئی۔ میں نے کافی منگوائی۔ ہم کچھ دیر بالکل خاموش رہے۔

نہ میں نے کوئی بات کی اور نہ زری نے کچھ کہا پھر آہ بھر کر بولی۔

"کیا تمہیں مجھ سے شادی کر کے سکھ مل سکے گا۔ میں تم سے ساری زندگی نفرت کروں گی۔ مجھے زندگی بھر یہ بات نہ بھول سکے گی کہ تم نے مجھے بلیک میل کیا تھا"

میں نے سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر کہا۔

"میں ہر قیمت پر اپنی محبت کو حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ تم کرو یا نہ کرو۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ میں اپنی زندگی کی بقا کے لئے تمہیں حاصل کر کے رہوں گا"

اگر میں نے تم سے شادی نہ کی تو کیا تم واقعی تصویریں سکندر کو اور میرے باپ کو پوسٹ کر دو گے؟"

میں نے جیب سے دو لفافے نکال کر میز پر رکھ دیئے۔ جن میں تصویریں بند تھیں اور جن پر سکندر کا ولائیت کا اور اس کے باپ کا لاہور کا ایڈریس لکھا ہوا تھا۔ زری نے سر جھکا لیا۔ میں نے لفافے پھر جیب میں ڈال لئے۔

"میں صرف کل تک تمہارا انتظار کروں گا"

"میں پاگل ہو جاؤں گی"

میں کچھ نہیں جانتا۔ پرسوں صبح نو بجے میں اپنے دفتر میں وکیل کے

ساتھ تمہارا انتظار کروں گا۔ اگر تم آگئیں تو اسی وقت چل کر عدالت میں شادی کرلیں گے۔ اگر دس بجے تک تم نہ آئیں تو پورے سوا دس بجے یہ دونوں لفافے ڈاک میں ڈال دیئے جائیں گے۔

اتنا کہہ کر میں اٹھا اور ہوٹل سے باہر آگیا۔

دوسرے روز پورے دس بجے زری کی گاڑی میرے دوست کے دفتر کے نیچے آکر رکی۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوئی تو خوشی سے میرا چہرہ چمکنے لگا۔ زری نے آکر کہا کہ وہ مجھ سے شادی پر تیار ہے میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ میں نے اپنے وکیل کو ساتھ لیا اور ہم عدالت میں مجسٹریٹ کے سامنے حاضر ہوگئے۔

کوئی آدھ گھنٹے رسمی اندراج اور بیانات کے بعد میں اور زری رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئے۔ میں بے حد مسرور تھا۔ لیکن ایک بات کی کھٹک ضرور تھی کہ زری اپنے ساتھ سونے کا ایک بھی زیور ساتھ نہ لائی تھی۔ لیکن میں نے کوئی پرواہ نہ کی شہد کی مکھی میرے قابو میں آگئی تھی۔ اب شہد کے چھتے کا سراغ لگا چنداں مشکل کام نہیں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ زری کا باپ ہم دونوں کو معاف کردے گا۔ اور میں اس کے خاندان سے منسلک ہو کر اپنے خاندان کو بلند کرسکوں گا۔

شام کو میں نے شہزان میں ایک زبردست پارٹی دی۔ اس پارٹی

پر میرا ایک ہزار روپیہ اٹھ گیا۔ اب تک میں کوئی پندرہ سولہ ہزار کا قبضہ کر چکا تھا۔ رات کو میں اور زری لاہور کے شاندار ہوٹل کے کمرے میں آ گئے۔ کمرے میں آ کر ہم نے کپڑے تبدیل کیے۔ زری نے سب سے پہلے یہ مطالبہ کیا۔ کہ نیگٹو اور تصویریں اس کے سامنے جلائی جائیں اب مجھے ان تصویروں کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

میں نے سوٹ کیس میں سے سولہ کے سولہ نیگٹو اور تصویریں نکال کر زری کے ہاتھ میں دے دیں۔ اس نے انہیں آتشدان میں پھینک دیا جہاں آگ جل رہی تھی۔ تصویریں بھڑک کر جلیں اور راکھ ہو گئیں۔ زری نے اطمینان کا سانس لیا اور بستر پر گر کر لیٹ گئی۔ جب میں اس کے پاس آنے لگا تو اس نے کہا۔

"میری طبیعت خراب ہے۔"

میں نے کوئی مزاحمت نہ کی اور دوسرے پلنگ پر لیٹ گیا۔ کیونکہ جس مقصد کے لیے میں نے زری سے شادی کی تھی وہ پورا ہو گیا تھا۔ اب صرف اس کے باپ سے سولہ ہزار روپے وصول کرنا باقی تھے۔ اس کے متعلق مجھے یقین تھا کہ وہ میری جیب میں پڑے ہیں۔ زری نے کہا۔

"میں اپنے باپ کو اب منہ نہیں دکھا سکتی۔"

میں نے کہا

"باپ معاف کر دیا کرتے ہیں"۔

"تم میرے باپ کو نہیں جانتے وہ میری لاش پر بھی اب نہیں آئے گا"۔

میں ڈر سا گیا۔ اگر سچ مچ زری کے باپ نے ہمیں معاف نہ کیا۔ تو پھر کیا ہو گا۔ پھر تو سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ لیکن ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ ضرور معاف کر دے گا۔ بیٹیوں کو باپ معاف کر دیا کرتے ہیں۔ اس کے باوجود مجھے احساس ہوا کہ میں نے سول میرج کر کے اور تصویروں کے ساتھ ٹیکٹو جلا کر دو غلطیاں کی ہیں۔ لیکن اب کچھ نہ ہو سکتا تھا۔

ایک ہفتہ گذر گیا۔ اب کچھ زری کو بھی معلوم ہو گیا کہ میں اتنا امیر کبیر آدمی نہیں ہوں۔ جتنا کہ میں زری کو بیان کیا کرتا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ میرے پاس کوئی گاڑی نہیں۔ میں بنک میں ساڑھے چار سو کا ملازم ہوں۔ میرا کوئی بزنس نہیں ہے اور یہ کہ میں ہوٹل رہتا ہوں۔ مگر وہ گھر سے بھاگ کر مجھ سے بیاہ کر چکی تھی۔ اب اس کا گھر میں بھی کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔

دوسری طرف دفتر میں حسابات کی پڑتال شروع ہو گئی۔ چیف اکاؤنٹنٹ

نے فوراً معلوم کیا کہ سولہ ہزار روپیہ غائب ہے۔ اس نے مشتبہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے اپنے قصور کا اعتراف کرتے ہوئے بتلایا کہ مجھے روپیوں کی ضرورت تھی۔ میں نے خرچ کر لئے ہیں۔ اور بہت جلد واپس کر دونگا۔

اگر چھ روز کے اندر اندر رقم سیف میں واپس نہ رکھی گئی تو مجھے مجبوراً منیجر کو اطلاع کرنی پڑے گی۔ پھر وہ پولیس میں فون کرنے پر مجبور ہو گا۔

میں لرز سا گیا۔ مگر مجھے یقین تھا کہ میں زری کے باپ سے اتنی رقم قرض لے لوں گا۔

گھر یعنی ہوٹل کے کمرے میں آکر میں نے زری کو مجبور کیا کہ وہ میرے ساتھ اپنے باپ کے پاس جائے۔ ہم اس سے جاکر معافی مانگ لیں گے۔ زری کے انکار کے باوجود میں اسے ساتھ لے کر اس کے باپ کے ہاں پہنچ گیا۔ اس کے باپ کا رنگ ہم دونوں کو دیکھتے ہی سرخ ہو گیا۔ اس نے دروازے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

"اگر تم دونوں اپنی زندگی چاہتے ہو تو اسی وقت الٹے پاؤں واپس چلے جاؤ۔ وگرنہ میں تم دونوں کو شوٹ کر دوں گا۔"

بندوق اس نے جھپٹ کر اپنے ہاتھ میں لے لی۔ زری ڈر کر باہر بھاگ گئی۔ میں نے مصلحتاً بات کرنے کی کوشش کی تو اس کے باپ نے بندوق کی نالی میری طرف کر دی۔

اگر تم نے مزید بات کرنے کی کوشش کی تو گولی تمہارے سینے سے پار ہو گی۔

میں نا امید ہو کر باہر نکل آیا۔ کھیل ختم ہو گیا تھا۔ پردہ گر چکا تھا۔ اب پولیس مجھے ہتھکڑی لگا کر جیل لے جائے گی۔ ساری عمر جیل کی چار دیواری میں قید رہ کر سڑنا ہو گا۔ مستقبل نے ایک مہیب اور ڈراونی شکل مجھے دکھائی۔ میں لرز اٹھا۔ میری روح کانپ گئی۔ میں نے سبھی دوستوں سے امداد طلب کی۔ مگر اتنی رقم کوئی کیسے دے دیتا۔

زری کو حالات کی نزاکت کا علم ہو گیا تھا۔ وہ اس کے مسکرانے کا وقت تھا۔ وہ خاموش تماشائی بنی میری بے بسی کا تماشہ دیکھ رہی تھی قدرت مجھ سے میرے گناہوں کا بدلہ لے رہی تھی۔ انتقام لے رہی تھی۔ اور میں بے بس و مجبور تھا۔ میں نے زری سے آخری بار مدد کی درخواست کی۔ لیکن اس نے یہ کہہ کر منہ موڑ لیا کہ وہ خود میرے سہارے پر زندہ ہے۔ وہ کیا کرے۔ وہ نواب باپ کے گھر بھی نہیں جا سکتی۔ اس کے تو سب دروازے بند ہو گئے ہیں۔

میں دو روز ہوٹل کے کمرے میں بند پڑا سوچتا رہا کہ کیا کروں؟ کہاں سے جا کر امداد طلب کروں؟ دماغ جواب دے گیا تھا۔ دوست جواب دے گئے تھے۔ زری تماشہ دیکھ رہی تھی۔ اس بھری دنیا میں میرا کوئی نہیں تھا۔ مجھے پروین یاد آ گئی۔ اگر آج وہ زندہ ہوتی۔ تو اپنی جان بیچ کر بھی میری امداد ضرور کرتی۔ وہ مجھ پر جان نچھاور کر دیتی۔ مگر مجھے جیل جانے سے بچا لیتی۔ لیکن پروین اب اس دنیا میں نہیں تھی۔ اور ساری دنیا میری بیری ہو رہی تھی۔ آج میں دوسرے روز رات کو بارہ بجے اٹھا۔ معمولی سے کپڑے ساتھ لیے اور زری کو پلنگ پر سوتا چھوڑ کر ہوٹل سے باہر نکل آیا۔ رات چار بجے تک لاہور ریلوے سٹیشن کے پلیٹ فارم پر گھومتا رہا۔ پھر ایک گاڑی میں سوار ہو کر کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔

۱۰

جب میں اگلے روز دفتر نہ گیا تو بینک کے خزانچی کو تشویش
ہوئی۔ جب دوسرے روز بھی میں بنک سے غیر حاضر رہا تو خزانچی
نے منیجر کے پاس جاکر بھانڈا پھوڑ دیا کہ بنک میں ہزاروں روپیوں کا غبن
ہوگیا ہے۔ معاملہ پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ مجھے مفرور ملزم قرار
دے دیا گیا۔ اخباروں میں میری تصویر کے ساتھ اشتہار چھپ گئے۔ زری
سے پوچھ گچھ کی گئی۔ اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اسے اس کے امیر
باپ کے اثر ورسوخ نے بچا لیا۔ باپ نے جب اسے بے یار و
مددگار دیکھا تو اپنے گھر واپس بلا لیا اور اسے معاف کر دیا۔

اب میری کہانی سنئے کہ اس رات چار بجے کے بعد لاہور سے فرار ہونے کے بعد مجھ پر کیا گذری - میں نے ملتان کا ٹکٹ لے لیا تھا - کیونکہ ملتان میں میرا ایک دوست رہتا تھا - میرا خیال تھا کہ میں وہاں جا کر اس سے مدد کا طلبگار ہوں -

کوئی نو بجے کے قریب میں ملتان پہنچ گیا - سٹیشن سے تانگہ کرا کر میں سیدھا اپنے دوست کے ہاں پہنچا - اس کو سارا ماجرا سنا دیا - اس نے بڑی ہمدردی کا اظہار کیا - لیکن رقم اتنی بڑی تھی کہ وہ بھی کچھ نہ کر سکا - میں دو روز اس کے پاس ٹھہرا - تیسرے روز جب اخبار آیا تو اس کے آخری صفحے پر اپنی تصویر اور پولیس کی طرف سے گرفتاری کا اعلان پڑھ کر میرے ہوش و حواس جواب دے گئے - میرا دوست بھی پریشان ہو گیا - میری گرفتاری پر ایک ہزار روپے کا اعلان کیا گیا تھا - میرے دوست کی عزت اب خطرے میں تھی - چنانچہ اسی رات میں نے اپنا حلیہ دیہاتیوں کا سا بنایا اور ایک پسنجر ٹرین پر سوار ہو کر کراچی کی طرف روانہ ہو گیا - ریل کھچا کھچ بھری ہوئی تھی - اس میں سبھی دیہاتی قسم کے لوگ سوار تھے - میں نے بھی صافہ اور چادر باندھ رکھی تھی - مجھے کوئی نہ پہچان سکا - رات بھر گاڑی چلتی رہی -

صبح حیدر آباد کے سٹیشن پر ریل پہنچی تو ایک سپاہی گھورتا ہوا ڈبے

کے پاس آیا۔ میری جان خشک ہو گئی۔ لیکن خدا نے مہربانی کی۔ وہ اسی طرح گھورتا ہوا آگے نکل گیا۔ ٹرین چل پڑی۔ میں کراچی آگیا۔ کراچی میں میرے کچھ دوست رہتے تھے مگر میں ان میں سے کسی کے پاس نہیں جا سکتا تھا۔ کیا خبر کس کا دل بے ایمان ہو جائے اور وہ مجھے پولیس کے حوالے کر دے۔ ساری دنیا پر سے میرا اعتماد اٹھ گیا تھا۔ میرے پاس کوئی ایک سو بیس کے قریب روپے تھے جو میں نے سنبھال کر صدری کی اندرونی جیب میں رکھے ہوئے تھے۔ کراچی شہر میں میں کئی بار آچکا تھا۔ لیکن ملزم کی حیثیت سے نہیں۔ بلکہ ایک پرسکون امن پسند شہری کی حیثیت سے۔ پچھلی بار جب میں کراچی آیا تھا۔ تو سیکنڈ کلاس میں سفر کیا تھا۔ میں نے بہترین سوٹ پہن رکھا تھا۔ اور قلی میرا سامان اٹھائے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ لیکن آج حالات مختلف تھے۔ آج میں ایک قتل کے مفرور ملزم کی حیثیت سے کراچی شہر میں داخل ہو رہا تھا۔ میرا بھیس دیہاتیوں الیسا تھا۔ پاؤں میں کھال کا جوتا تھا۔ میلی چادر بندھی تھی۔ سر پر صافہ تھا۔ اور گلے میں تعویز تھا۔ میری آنکھوں سے ڈر اور خوف ٹپک رہا تھا۔ میں سہم سہم کر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ ذرا سی آہٹ پر میں چوکنا ہو جاتا تھا۔ سپاہی کو دور ہی سے دیکھ کر روح فنا ہو جاتی تھی۔

انسان کے حالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔ ابھی وہ تخت پر بیٹھا لوگوں میں تحفے بانٹ رہا ہوتا ہے اور دوسرے ہی لمحے وہ گلیوں میں بھیک مانگ رہا ہوتا ہے۔ زندگی کا کھیل اپنے اندر ہر قسم کی ٹریجیڈی اور کامیڈی چھپائے ہوئے ہے۔ اس ناٹک میں اگر ایک سین ہنسانے کا ہوتا ہے تو دوسرے سین پر لوگوں کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں۔ سٹیشن سے باہر نکل کر میں کتنی ہی دیر یونہی شہر کی عالیشان سڑکوں پر گھومتا رہا۔ پھر سوچا کہ اس طرح کھلے بندوں پھرنا ٹھیک نہیں۔ کیونکہ میری تصویر کراچی کے اخباروں میں بھی چھپ چکی تھی۔ اگر کسی نے راہ چلتے میں پہچان لیا تو قیامت آ جائے گی۔

میں کیماڑی کے علاقے میں آ گیا۔ یہاں میں نے ایک گھٹیا سے بھٹیار خانے کے بنچ پر بیٹھ کر روٹی کھائی اور سگریٹ سلگا کر دیر تک اخبار پڑھتا رہا۔ اچانک ایک سپاہی اندر آیا۔ مجھے گھور کر ایک بنچ پر بیٹھ گیا۔

"سنتری جی آج کیا کھاؤ گے؟"

بھٹیار خانے کے مالک نے پوچھا۔

سنتری نے کہا۔

"آلو گوبھی ہی ڈال دو میاں"۔

سنتری کھانا کھانے لگا۔ اس دوران میں اس نے دو ایک بار

میری طرف غور سے دیکھا۔ جیسے اسے یقین نہ آرہا ہو کہ میں اصل میں دیہاتی ہی ہوں۔ میں نے جلدی سے پیسے ادا کئے اور وہاں سے باہر نکل آیا۔

یہاں سے میں ایک بس میں بیٹھا اور سمندر کی طرف نکل گیا۔ سمندر سے مجھے شروع ہی سے بڑا پیار رہا ہے۔ کھلا اور عظیم چھاتی والا سمندر ــــ اس میں ماں کی مامتا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ سمندر مجھے ضرور پناہ دے گا۔ قانون میرا پیچھا کر رہا تھا۔ اور میں آگے آگے بھاگ رہا تھا۔

باندرہ آئی لینڈ پر پہنچ کر میں نے بس چھوڑ دی اور پیدل ہی سمندر کی طرف چلنا شروع کر دیا۔ دور سے سمندر کی چمکتی ہوئی لکیر دکھائی دینے لگی۔ ٹھنڈی اور نم دار ہوا برابر آرہی تھی۔ اب میں ساحلِ سمندر پر آگیا تھا۔ سمندر کی عظیم الشان لہریں دور سے آکر ساحل کی ریت پر جھاگ اڑاتی پھیل رہی تھیں۔ اور پھر واپس جا رہی تھیں۔ میں ایک جگہ پتھر پر بیٹھ گیا۔ اور سگریٹ سلگا کر اپنی قسمت کی کایا پلٹ پر غور کرنے لگا۔ کتنی بھلی اور پرسکون زندگی گذر رہی تھی۔ لیکن ذرا سے لالچ کے خیال نے مجھے کتنی دردناک مصیبت میں مبتلا کر دیا تھا۔ قدرت نے مجھ سے میرے گناہوں کا پورا پورا بدلہ لیا تھا۔

سمندر کی لہریں پتھروں سے ٹکرا کر واپس جا رہی تھیں۔ ہوا ٹھنڈی اور مرطوب تھی۔ دور ساحل کے ساتھ ساتھ کراچی کی اونچی اونچی بلڈنگیں جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی۔ چلی گئی تھیں۔ ان بلڈنگوں میں لوگ کیسے آرام سے کام کر رہے ہوں گے۔ کوئی لفٹ سے نیچے اتر رہا ہو گا۔ کوئی اوپر جا رہا ہو گا۔ کوئی نیک دل عورت بچہ گود میں اٹھائے اپنی ماں سے ملنے جا رہی ہو گی۔ کوئی عورت بازار میں کسی دکان کے سامنے کھڑی سودا خرید رہی ہو گی۔ اتنے بڑے شہر میں ایک آدمی بھی پریشان اور بدحال نہ ہو گا۔ جتنا اس وقت میں تھا۔ مجھے اپنی حالت پر ترس آ گیا۔ میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ مجھے راولپنڈی سٹیشن پر پنڈی مری ٹرانسپورٹ کا وہ دفتر یاد آ گیا۔ جہاں میں نے زری کو ٹیڈی لباس میں سب سے پہلے دیکھا تھا۔

کاش! میں اسے کبھی نہ دیکھتا اور اگر دیکھ بھی لیا تھا تو اس کا پیچھا نہ کرتا۔ آخر مجھے کیا ضرورت پڑی تھی کہ میں کسی دوسرے کی بہنوں کے پیچھے مارا مارا پھرتا رہوں۔ مجھے کیا ہو گیا تھا۔ اس وقت اگر مجھے کوئی بتا دیتا کہ اس پیچھا کرنے کا انجام اس قدر ہولناک ہو گا۔ تو میں ایسا کبھی نہ کرتا۔ میں فوراً کوہ مری سے واپس لاہور آ جاتا اور نہایت ذمہ دار آدمی کی طرح اپنے بینک میں کام کرنے لگتا۔ مگر

ہونی تو ہو کر رہتی ہے۔ یہ مصیبتیں میری تقدیر میں لکھی ہوئی تھیں۔ یہ غم تو مجھے سہنے ہی تھے۔ یہ صدمے تو مجھے اٹھانے ہی تھے۔ مجھے بھلا ان دکھوں سے، جلاوطنی اور دربدری کی ان تکلیفوں سے کون بچا سکتا تھا۔

"کون ہو تم؟ یہاں کیا کر رہے ہو؟"

میں اس آواز پر اچانک چونک اٹھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک سپاہی کھڑا تھا۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ میں نے سوچا کہ سمندر میں کود جاؤں۔ میں سمندر میں چھلانگ لگانے والا تھا کہ سپاہی نے مجھے کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔

"جواب کیوں نہیں دیتے۔ میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔"

میں نے اپنے ہوش ٹھکانے کرتے ہوئے کہا۔

"یونہی سنتری جی بیٹھا سمندر کی سیر دیکھ رہا تھا۔"

"سیر دیکھ رہے ہو یا خودکشی کرنے کو سوچ رہے ہو؟"

سپاہی نے مونچھوں پر تاؤ دے کر کہا۔

پہلے میرا خیال تھا کہ سپاہی نے مجھے پہچان لیا ہے۔ لیکن اب یہ جان کر تسلی ہوئی کہ اس نے مجھے بالکل نہیں پہچانا تھا۔ وہ محض اس لئے مجھ سے پوچھ گچھ کر رہا تھا کہ کہیں میں خودکشی تو نہیں کرنے

والا۔ کیونکہ پچھلے کچھ روز سے سمندر میں چھلانگ لگا کر خود کشی کرنے کی دو تین وارداتیں ہو چکی تھیں اور اب وہاں پولیس دن رات گشت لگاتی تھی۔

"میں نے ہاتھ جوڑ کر دیہاتیوں ایسے لہجے میں کہا۔
مائی باپ ہم کیا جانیں خودکشی کو۔ ہمارے تو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں حضور۔ انہیں رشتہ داروں کے پاس چھوڑ کر خود سمندر دیکھنے آگیا ہوں"

سپاہی نے پوچھا۔

"کون سے شہر کے رہنے والے ہو؟"

"جی ملتان کا ہوں جناب"

"تمہاری پنجابی تو ملتانی سے ذرا مختلف ہے؟"

میں نے غلطی کا فوراً اندازہ لگا کر کہا۔

"حضور میں زیادہ دیر لائل پور کے ضلع میں رہا ہوں" وہاں چک ۵۲ میں اپنی ایک آٹے کی چکی ہے۔ اب دو سال سے ملتان میں ہوں اور چاول کا چھوٹا موٹا کام کرتا ہوں"

"ہوں ــــــ" اتنا کہہ کر سپاہی خاموش ہو گیا۔

"پھر بولا"

اچھا دیکھو ——— اس پتھر پر نہ بیٹھو۔ یہاں سے گر پڑو گے۔ سمندر ہی دیکھنا ہے تو ذرا چل پھر کر دیکھو

"جو حکم سرکار"

میں تو پہلے ہی وہاں سے نو دو گیارہ ہونا چاہتا تھا۔ چنانچہ جلدی سے اٹھا اور مغرب کی طرف سمندر کے ساتھ ساتھ چل پڑا۔ دراصل سپاہی مجھے اس لئے نہیں پہچان رہے تھے۔ کہ اخبار میں میری اپ ٹو ڈیٹ تصویر چھپی تھی۔ اس میں میں نے سوٹ پہن کر ٹائی وغیرہ لگا رکھی تھی۔ اور اب حلیہ ہی دیہاتیوں ایسا تھا۔ جب تک کوئی دیکھ کر غور نہ کرے۔ مجھے نہیں پہچان سکتا تھا۔ کچھ دو روز کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔

وہ رات میں نے ساحلِ سمندر پر ایک پرانے کھوکھے کے نیچے ریت پر لیٹ کر گزاری۔ رات کو مجھے سردی بھی لگی اور چیونٹیوں نے بھی ٹرائنگ کیا۔ دوسرے روز میں ہاکس بے کی طرف نکل گیا وہاں ایک بڈھے ماہی گیر سے ملاقات ہو گئی اس سے ذکر کیا کہ کہیں نوکری مل جائے تو زندگی کا آسرا بن جائے

بڈھے ماہی گیر نے پوچھا۔

"بیٹے کچھ پڑھ لکھ بھی لیتے ہو یا نہیں؟"

میں اپنا آپ ہر حالت میں چھپانا چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔

"نہیں بابا! میں ان پڑھ ہوں"۔

بڈھا سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا

آج تو تم میری جھونپڑی میں ٹھہرو۔ کل تمہاری نوکری کی بات کروں گا۔ یہاں سیٹھ ہارون جی کی ہٹ ہے۔ وہاں ایک چوکیدار کی ضرورت ہے۔ اگر وہ مان گئے تو چوکیداری مل جائیگی۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ دوسرے روز بڈھے ملّاح نے سیٹھ صاحب سے بات کی۔ سیٹھ نے مجھے بلا کر اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ کچھ سوال کیئے اور مطمئن ہو کر مجھے چوکیدار رکھ لیا۔ پچاس روپے تنخواہ اور کھانا پینا سیٹھ کے ہاں سے۔

مجھے تو سر چھپانے کو جگہ چاہیے تھی۔ روپیوں کا اب لالچ نہیں رہا تھا۔ دولت کی ہوس نے وہ سبق دیا تھا کہ میرا دماغ درست ہو چکا تھا اب میں عزت کی روکھی سوکھی ہی کھا کر ساری زندگی بسر کر سکتا تھا۔ میرا کام سیٹھ صاحب کی ہٹ کی دیکھ بھال کرنا تھا۔ "ہاکس بے" پر اس قسم کی عالیشان جھونپڑیاں بہت ہیں۔ ان میں ہر دوسرے تیسرے روز مالک لوگ آ کر پک نک مناتے ہیں۔ اور کھیل کود بچاتے ہیں سارا سارا دن میں اکیلا ہی ہٹ کے اندر اپنی کوٹھڑی میں چپ چاپ بیٹھا رہتا۔ دوپہر کو برآمدے وغیرہ کی صفائی اور فرنیچر کی جھاڑ پونچھ کرتا۔

بالکل نوکروں کی طرح ــــــ قسمت نے یہ دن بھی دکھانا تھا کہ اپنے پاس ہو کر لوگوں کے گھروں میں جھاڑو دیتا پھروں۔

مجھے معلوم تھا کہ میرا وہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں ہے چنانچہ میں نے بڈھے ملاح سے مل کر وہاں سے کویت دبہران کی طرف نکل جانے کا منصوبہ بنایا۔ بڈھے ملاح کو میں نے صرف اتنا ہی بتایا کہ میرا بڑا بھائی کویت میں ملازم ہے۔ اور میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ جہاز کا ٹکٹ خرید سکوں۔ اور کویت میں جا کر ہی زیادہ پیسے کما کر بال بچوں کو بھی وہاں بلا سکتا ہوں۔ کراچی کے سمندر سے عربوں کی ناجائز کشتیاں اکثر خلیج فارس کے سمندروں کی طرف جاتی رہتی ہیں۔ بڈھے ملاح نے مجھے ایک عرب ملاح سے ملا دیا۔ اس نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر کر مجھے نشتر ایسی تیز نگاہوں سے گھورا اور کہا۔

"ہم تمہیں کویت پہنچا دیں گے۔ لیکن کرایہ سو روپے سے کم نہ ہو گا۔"

میں نے کہا

"شیخ صاحب استر روپے تو جہاز پر لگتا ہے۔"

اس نے کہا۔

یہ تمہیں کس احمق نے بتا دیا۔ اور پھر پاسپورٹ بھی تو بنوانا پڑتا ہے۔

"اگر سو روپے منظور ہیں تو جمعے کے روز رات کے ایک بجے یہاں تیار رہنا۔ نہیں تو میرا سر نہ کھاؤ"۔

اتنا کہہ کر وہ جانے لگا تو میں نے کہا

"منظور ہے شیخ صاحب! جمعے کے روز رات کے ایک بجے میں سو روپے کا نوٹ لے کر یہاں بالکل تیار رہوں گا"

روپے میرے پاس موجود تھے۔ وہ اگر دو سو روپے بھی کرایہ بتاتا تو میں حیل حجت نہ کرتا۔ لیکن میں زیادہ اشتیاق کا اظہار نہ ہو جائے کہ میں ہر قیمت پر پاکستان سے بھاگ جانا چاہتا ہوں۔ لیکن جب وہ واپس جانے لگا تو میں نے فوراً ہاں کر دی۔ اب میں بڑی بےصبری سے جمعے کے روز کا انتظار کرنے لگا۔ ابھی جمعہ میں دو روز باقی تھے خدا خدا کر کے جمعہ کا دن آ گیا۔ میں نے صبح ہی سے تیاری کر لی تھی سیٹھ سے میں نے کچھ نہ کہا۔ بڈھے ملاح کو میں نے اس بات پر راضی کر لیا تھا۔ کہ وہ میرے اچانک گم ہو جانے کی یوں اطلاع دے کہ میرے گھر سے اچانک میری ماں کے انتقال کی خبر آ گئی تھی اور میں چلا گیا۔

میں نے اپنے دو تین کپڑے دھو کر گٹھڑی میں باندھ لئے تھے میں بڑی بےتابی سے رات ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ اگر یہ رات

حریت سے گذر جائے تو میں قانون کی گرفت سے آزاد ہو چکا ہونگا۔
میں اتنی دور نکل گیا ہوں گا کہ پولیس مجھے پھر کبھی گرفتار نہ کر سکے گی۔
کویت میں جا کر میں ایک نئی زندگی کا آغاز کروں گا۔ میں وہاں سے
آگے مصر یا یورپ نکل جاؤں گا۔ اور پھر کبھی لوٹ کر پاکستان نہیں
آؤں گا۔ میں بی۔ اے۔ پاس ہوں۔ مجھے نوکری مل جائے گی۔

شام ہو گئی۔ سمندر میں سورج غروب ہو گیا۔ دور کراچی شہر
کی بلند و بالا عمارتوں میں روشنیاں جگمگانے لگیں۔ سمندر کی لہروں کا رنگ
مٹیالا ہو گیا تھا۔ آسمان پر تارے نکل آئے اور ہوا زیادہ ٹھنڈی اور مرطوب
ہو گئی۔ سمندر کی لہروں کا شور زیادہ قریب سے سنائی دینے لگی۔

خدا جانے کس بے چینی سے میں نے بڈھے ملاح کی جھونپڑی میں
آدھی رات بسر کی۔ پورے ایک بجے میں اور بڈھا ملاّح باہر نکل کر سمندر
کے کنارے کھڑے ہو گئے۔ اچانک ہمیں دور سے بیٹری کی روشنی
جلتی بجھتی نظر آئی۔ بڈھے نے کہا۔

"وہ لوگ آ گئے ہیں۔ ہوشیار ہو جاؤ۔"

بڈھے ملاح نے بھی بیٹری کو دو تین بار جلا کر بجھا دیا۔ پھر وہ مجھے
لیکر جھونپڑی کے اندر آ گیا۔

"اب نہیں ٹھہرو۔ باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں۔ وہ لوگ

خود آکر بلالیں گے۔"

کوئی پندرہ منٹ بعد وہی عرب شیخ گیلے کپڑے نچوڑتا اندر آیا اور میری طرف ہاتھ بڑھا کر بولا۔

"روپے لاؤ اور میرے ساتھ چلو۔"

میں نے جیب میں سے سو روپے کا نوٹ نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔ اس نے بیٹری جلا کر نوٹ کو خوب جانچ پرکھ کر دیکھا۔ اسے جیب میں ڈالا اور مجھے پیچھے پیچھے آنے کا کہہ کر باہر نکل گیا۔ بڈھے ملاح نے مجھے گلے لگا کر پیار کیا۔ دعا کی اور میں باہر نکل آیا۔ عرب شیخ کی بڑی سی بادبانی کشتی سمندر کی لہروں پر رات کے اندھیرے میں ہچکولے کھا رہی تھی۔

"چھلانگ لگا دو۔"

ہم نے سمندر میں چھلانگیں لگا دیں۔ اور تیرتے ہوئے کشتی کے قریب آ گئے۔ دو آدمیوں نے رسیوں کی مدد سے ہمیں اوپر کھینچ لیا ہمارے اوپر چڑھتے ہی بادبان کھول دیے گئے۔ اور کشتی سمندر کی لہروں پر کھلے سمندر کی طرف چل نکلی۔ یہ بڑی پرانی اور دقیانوسی قسم کی کشتی تھی۔ اس میں میرے ایسے کچھ اور لوگ بھی سوار تھے جو ایک دوسرے کے قریب چپ چاپ بیٹھے تھے۔ عرب

ملاح کشتی کو بڑی تیزی سے آگے ہی آگے کھینچے لئے جا رہے تھے
وہ کراچی کے سمندر سے جلد از جلد نکل جانا چاہتے تھے۔ میں بھی
چپ چاپ ایک طرف رسوں کے بڑے سے ڈھیر کے ساتھ
ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور خدا سے دعائیں مانگنے لگا کہ وہ مجھے بخیر و خوبی
وہاں سے نکال دے اور قانون کی گرفت سے آزاد کر دے۔

ہمیں سمندر میں سفر کرتے بمشکل کوئی دو اڑھائی گھنٹے ہی ہوئے ہوں
گے۔ مشرق کی طرف پو پھٹنے لگی تھی اور صبح کی ہلکی ہلکی نیلی جھلکیاں نمودار
ہونے لگی تھیں کہ اچانک فضا میں دو تین فائروں کی آواز گونج گئی۔ ہم
سب حیران ہو گئے۔ عرب ملاحوں میں بھگدڑ مچ گئی۔

"کسٹم آگیا! کسٹم آگیا"

انہوں نے کشتی کی رفتار اور تیز کر دی۔ اور بندوقیں نکال کر کشتی
کے ڈیک پر لیٹ گئے۔ ان کی بندوقوں کا منہ مشرق کی طرف
تھا۔ جدھر سے کسی موٹر لانچ کی دھیمی دھیمی آواز مسلسل آرہی تھی۔ یہ
آواز لمحہ بہ لمحہ قریب سے قریب تر ہوتی جا رہی تھی۔ میرا رنگ فق ہو
گیا تھا۔ اب وہاں سے بچ نکلنا محال تھا۔ خشکی ہوتی تو آدمی کہیں کود کر
بھاگ بھی سکتا تھا۔ اتنے کھلے اور گہرے اور ہیبتناک سمندر میں کود کر
میں سوائے موت کے منہ کے اور کہیں نہیں جا سکتا تھا۔ میں اپنی

قسمت پر آٹھ آٹھ آنسو بہا رہا تھا جس نے مجھے اس طرح بے بس کر کے
پھنسا دیا تھا۔ ظاہر ہے یہ لوگ ہمیں پکڑ کر تھانے لے جائیں گے اور
وہاں صبح کو مجھے پہچان لیا جائے گا اور سارا کھیل ختم ہو جائے گا۔
موٹر لانچ کی رفتار اب بہت قریب آ گئی تھی اور دور سے اس
کی روشنی بھی دکھائی دینے لگی تھی ۔ اچانک ایک عرب ملاح نے فائر
کر دیا۔ اب ہماری کشتی سے دھڑا دھڑ رائفلوں کے فائر ہونے لگے
دوسری طرف سے بھی گولیاں چلنے لگیں۔ وہاں باقاعدہ مقابلہ ٹھن گیا۔
ہم اوندھے منہ ڈیک پر لیٹ گئے ۔ گولیاں پوری شدت سے
چل رہی تھیں ۔ کوئی آدھ گھنٹہ کی فائرنگ کے بعد ہماری کشتی کے ملاحوں
نے ہتھیار پھینک دیئے ۔ ان کے پاس اسلحہ ختم ہو گیا ۔ کسٹم والوں
کی لانچ اب ہمارے قریب آ کر رک گئی ۔ اور اس میں سے رائفل بردار
سپاہی کود کود کر ہماری کشتی میں آ گئے ۔ ہم سبھوں کو گرفتار کر کے ایک
جگہ مسلح گارڈ کے پہرے میں بٹھا دیا گیا۔ کشتی کے بادبان بند کر کے
اسے لانچ کے ساتھ باندھ دیا گیا ۔ اور لانچ پوری رفتار کے ساتھ واپس
کراچی کی بندرگاہ کی طرف روانہ ہو گئی ۔ میں نے سر جھکا لیا تھا ۔ اور میری
آنکھوں سے آنسو ٹپک رہے تھے ۔ قدرت نے بنا بنایا کھیل
بگاڑ کر رکھ دیا تھا ——— قدرت مجھے میرے گناہوں کی پوری سزا

دینا چاہتی تھی۔

اور ایسا کرنے کا اُسے پورا حق بھی تھا۔

۱۱

کراچی پولیس نے مجھے فوراً شناخت کر لیا۔ لاہور پولیس کو بذریعہ تار خبردار کر دیا گیا کہ مفرور ملزم گرفتار کر لیا گیا ہے۔ دو روز بعد مجھے پولیس کے سپاہیوں کی حفاظت میں لاہور پہنچا دیا گیا۔ آخر جس بات کا ڈر تھا وہ ہو کر رہی۔ اخباروں میں میری تصویر کے ساتھ خبریں چھاپی گئیں۔ ہر جگہ میری بدنامی ہوئی۔ مجھے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ مقدمہ شروع ہو گیا۔ شہر میں کسی نے میری ضمانت نہ دی۔ کوئی دوست مجھ سے ملاقات کرنے حوالات نہ آیا۔ حوالات سے کچھ روز بعد مجھے جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ میری زندگی کے انتہائی بدنصیب دن شروع ہو گئے۔ یوں لگتا جیسے میرا کوئی نہیں رہا۔ جس شہر میں میں نے عیش و آرام دیکھے تھے۔ اب میرے

لئے ایک اجنبی اور غیر آشنا شہر تھا۔ پرویز ایک بار مجھ سے ملاقات کرنے آیا۔ اور تھوڑی دیر تک اپنے ہی کاروبار کی بدحالی کا رونا رو کر واپس چلا گیا۔

میرے پاس ایک پائی بھی نہیں تھی۔ وکیل کہاں سے کرتا۔ مقدمے کی کاروائی شروع ہو گئی۔ پولیس نے مجھ سے روپیہ برامد کرانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن میرے پاس روپیہ ہوتا تو برامد بھی ہو جاتا۔ میری جیب تو بالکل خالی تھی۔

چھ ماہ تک مقدمہ چلتا رہا۔ ساتویں مہینے جا کر فیصلہ ہوا اور مجھے پانچ سال قید سخت اور پانچ ہزار روپے جرمانہ کی سزا سنا دی گئی۔ جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں مزید ایک سال کی سزا بھگتنا پڑتی تھی میں جرمانہ کہاں سے ادا کر سکتا تھا چنانچہ پانچ سال کے لئے ہم جیل میں بھیج دیئے گئے۔ اگرچہ یہ سب کچھ انتہائی ناخوشگوار ہوا تھا لیکن چلو ایک طرح سے فیصلہ تو ہو گیا۔ اب کم از کم اتنا تو معلوم تھا کہ پانچ برس کے بعد میں آزاد ہوں اور باہر نکل کر اپنی مرضی کے مطابق جہاں اور جب چاہوں گا نئی زندگی شروع کر سکوں گا۔

پہلے پہل جیل کی زندگی بڑی مشکل لگی۔ مگر آہستہ آہستہ اس کا بھی عادی ہو گیا۔ میرا رویہ ہر ایک کے ساتھ بڑا شریفانہ تھا۔ جیل میں میری بڑی

عزت ہونے لگی۔ چونکہ میں پڑھا لکھا تھا۔ اس لئے مجھ سے یہاں بھی
لکھائی پڑھائی کا کام لیا جاتا۔ جیل میں آئے مجھے بمشکل چھ سات ماہ ہوئے
ہوں گے کہ ملاقات کے وقت ایک سنتری نے مجھے آکر کہا۔

"بابوجی! تم سے کوئی ملنے آیا ہے۔"

میں حیران رہ گیا۔ کیونکہ آج تک مجھے کبھی کوئی جیل میں ملنے نہیں
آیا تھا۔ دوسرے قیدی جمعرات کو ملاقاتوں کے لئے باہر والے بڑے کمرے
میں جاتے مگر میں اپنی بارک میں ہی رہتا۔ کیونکہ مجھ سے ملنے کبھی کسی کی
چیٹ آئی ہی نہیں تھی۔ اب جب معلوم ہوا کہ مجھ سے بھی ملاقات کرنے
آیا ہے۔ تو دل خوش ہو گیا کہ چلو اس بھری دنیا میں ہمارا بھی تو کوئی
ہے!

میں نے سنتری سے پوچھا۔

"کون ہے؟"

سنتری نے مونچھیں مروڑ کر کہا

کوئی عورت ہے۔ گود میں بچہ بھی ہے

اب میں بہت حیران ہوا۔ گود میں بچے والی میری کوئی عورت
واقف نہ تھی۔ انہی خیالات میں گم میں بارک سے نکل کر ملاقات
کرنے والے کمرے میں آگیا۔ یقین جانیئے جب میں نے لوہے

کی موٹی موٹی سلاخوں کی دوسری جانب بنچ پر زری کو گود میں کوئی دو ماہ کا بچہ اٹھائے بیٹھا دیکھا تو میں دم بخود ہو کر رہ گیا۔

زری مجھے دیکھ کر اٹھی اور سلاخوں کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے پر بڑی اداس سی مسکراہٹ تھی۔ میں بھی سلاخوں کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔

"زری! تم ہو؟"

"ہاں! میں۔"

اس کے بعد میں خاموش ہو گیا۔ اور اس کی گود والے بچے کو تکنے لگا۔ دو ماہ کا ننھا سا گورا چٹا صحت مند لڑکا سفید چادر میں لپٹا چوسنی چوس رہا تھا۔ اور اپنی معصوم آنکھوں سے فضا میں کسی شے کو تک رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔

"یہ بچہ؟ —— یہ بچہ کس کا ہے؟"

زری نے آہستہ سے مسکرا کر کہا۔

"تم نے اپنے بچے کو بھی نہ پہچانا۔"

"میرا بچہ! میرا بیٹا! کیا کہہ رہی ہو زری؟"

میں نے دونوں ہاتھوں میں بچے کو اٹھا۔ اس کی آنکھیں اور پیشانی

بالکل اپنی ماں پر گئی۔ میں ایک تو اپنے بچے کو دیکھ کر اور دوسرے زری کو اپنے بچے کی ماں کے روپ میں دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ مجھے خوشی بھی تھی اور حیرت بھی۔

زری کسطرح اور کیسے مجھے واپس مل گئی۔ کیا اس دنیا میں ایسا بھی ہو سکتا تھا؟ یہ تو بالکل ایسی بات تھی کہ گھرے سیاہ بادلوں میں سے اچانک سورج نکل آئے اور چاروں طرف روشنی پھیل جائے۔

زری پہلے سے کچھ دبلی سی ہو رہی تھی۔ لیکن اس کے چہرے پر ایک نئی قسم کی پاکیزگی اور ماتما کی موہنی جھلکنے لگی تھی۔

میں نے بچے کو بے حد پیار کیا۔ بچہ رونے لگا۔ زری نے مسکرا کر بچہ واپس لے لیا۔

"تم نے تو اسے رلا دیا۔"

میں نے پوچھا۔

"زری! یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ تم کیسے مجھے واپس مل گئیں۔ تمہاری طرف سے تو میں بالکل ناامید ہو چکا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ دوبارہ تم میری زندگی میں بہار بن کر واپس آجاؤ گی۔"

زری نے ایک گہرا سانس لیا اور کہا۔

آج سے کچھ عرصہ پہلے مجھے بھی یہ خیال کبھی نہ آیا تھا کہ میں کبھی تمہارے

پاس واپس جاؤں گی۔ کیونکہ تم نے میرے ساتھ جو کچھ کیا تھا وہ مجھے تم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے متنفر کرنے کے لئے کافی تھا۔ جب تم بھاگ گئے تو مجھے ابا جان نے واپس گھر بلا لیا۔ میں اپنے گھر میں ہنسی خوشی رہنے لگی۔ ابا جان میری ہر بات کا خیال رکھتے۔ لیکن اچانک ایک ایسی بات ہو گئی جس نے میری زندگی کے سارے تصورات کو بدل کر رکھ دیا۔

میں نے بے تابی سے پوچھا۔

”وہ کیا؟“

نزری نے شرماتے ہوئے کہا۔

مجھے ایک دن محسوس ہوا کہ میں ماں بن گئی ہوں یعنی میری کوکھ میں تمہارا بچہ پرورش پا رہا ہے۔ جانے کیوں مجھے یوں لگا جیسے اس بچے نے میرے دل سے تمہارے خلاف سارے گلے شکوے دھو ڈالے ہیں اور میں تم سے محبت کرنے لگی ہوں۔ میں نے اس کا ذکر اپنی والدہ سے کیا۔ گھر میں بچہ ضائع کرنے کے بارے میں مشورے ہونے لگے۔ والد صاحب نے کہا کہ بچہ فوراً ضائع کرا دو۔ اسکے بعد ہم تمہاری شادی ایک نہایت اعلیٰ خاندان میں کروا دیں گے کیونکہ یہ بچہ ایک ذلیل باپ کی نشانی ہے۔ جب وہ ہی نہیں رہا تو

بچہ باقی کیوں رہے ہے۔ میں نے انکار کر دیا۔ میرے انکار پر گھر والے حیران ہو کر رہ گئے۔ کیونکہ میں نے ہمیشہ تمہاری مخالفت کی تھی ہمیشہ تمہارے خلاف زہر اُگلا تھا۔ اور گھر والوں کی ہاں میں ہاں ملاتی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ میں لڑکی ہنسی خوشی ان کے ساتھ ہسپتال جا کر بچہ ضائع کروا دوں گی۔ اور پھر ان کی مرضی کے مطابق شادی کر لوں گی۔ والد صاحب بہت غصہ میں آ گئے۔ انہوں نے گرج کر کہا۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تمہیں میرے گھر سے نکل کر اپنے خاوند ہی کے پاس جا کر جیل میں رہنا ہو گا۔ میں نے کہا مجھے منظور ہے۔ سب لاجواب ہو کر رہ گئے۔ اور حقیقت بھی یہی تھی۔ میرے دل میں جیسے خدا نے یہ بات ڈال دی تھی کہ بچے کو ضائع مت کروانا۔ جانے کیوں میرے دل میں بچے کے لئے اس قدر محبت بیدار ہو گئی تھی کہ مجھے یہ گوارا نہیں تھا کہ میں اپنے جگر کے ٹکڑے کو اپنے ہاتھوں ہلاک کر دوں۔ شاید میرے اندر چھپی ہوئی ماں بیدار ہو گئی تھی۔

مجھے گھر والوں نے لاکھ سمجھایا کہ میں اپنے قیدی شوہر سے طلاق لے لوں۔ بچہ ضائع کرا دوں اور ان کی مرضی کے مطابق کسی اعلیٰ آفیسر سے بیاہ کر لوں۔ مگر میں نے صاف صاف اور کھلے لفظوں میں کہہ دیا کہ میں ہرگز ہرگز ایسا نہیں کروں گی۔ میں اپنے بچے سے اور اپنے

خاوند سے محبت کرتی ہوں۔ میرے دل میں ان دونوں کے لئے بے حد محبت اور عقیدت بیدار ہو گئی ہے۔ میں اپنے خاوند کے ساتھ جیل میں جا کر زندہ رہ لوں گی۔ لیکن اسے طلاق دے کر کسی افسر کیا کسی بادشاہ سے بھی شادی نہ کروں گی۔

جب والد صاحب نے دیکھا کہ میں کسی صورت سے بھی باز نہیں آ رہی تو انہوں نے آخری دھمکی دی کہ اگر ایسی ہی بات ہے تو پھر میں تمہیں اپنی ساری جائیداد سے عاق کرتا ہوں۔ تم صرف اتنی دیر تک میرے گھر میں رہ سکتی ہو۔ جب تک کہ تمہارا خاوند جیل سے رہا ہو کر واپس نہیں آتا۔ اس کی جیل سے رہائی کے بعد تمہیں اس کے پاس ہی جا کر رہنا ہو گا۔ اور آئندہ سے ہمارا تمہارا کوئی تعلق نہیں ہو گا۔ میں نے کہا میں پڑھی لکھی لڑکی ہوں۔ میں باعزت طور پر نوکری کر کے اپنا اور اپنے بچے کا پیٹ پال سکتی ہوں۔ میں یہ پانچ سال کا عرصہ بھی آپ کے پاس نہیں ٹھہروں گی۔

میں نے پوچھا۔

"تو پھر تم نے کیا کیا؟"

انہی دنوں ایبٹ آباد کے ایک گرلز سکول میں استانی کی جگہ ہوئی۔ میں نے درخواست بھجوا دی۔ مجھے انٹرویو کے لئے بلایا

گیا۔ میں سیلکٹ ہو گئی۔ چنانچہ میں وہاں چلی گئی۔ وہیں ہسپتال میں میرا بچہ پیدا ہوا۔ اب میں ایبٹ آباد میں ہوسٹل میں رہتی ہوں۔ میں نے بچے کی دیکھ بھال کے لئے آیا نوکر رکھ لی ہے۔ کل مجھے تنخواہ ملی تو میں سیدھی تم سے ملاقات کرنے آ گئی ہوں۔

میں نے زری کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر محبت سے دبایا میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ خدا نے میرے گناہ معاف کر دیئے تھے۔ میں اپنے رب کا جسقدر بھی شکر ادا کرتا کم تھا۔ زری نے ٹوکری میں سے آڑو اور خوبانیاں نکال کر مجھے کھلائیں۔ وہ میرے لئے سگریٹ چاقولیٹ، مٹھائی اور جرابیں رومال وغیرہ خرید کر لائی تھی۔ میں ایک ایک چیز کو دیکھ رہا تھا۔ اور میری آنکھوں میں خوشی اور مسرت کے آنسو چھلک رہے تھے۔ جب ملاقات کا وقت ختم ہو گیا تو میں نے اپنے بچے کو جی بھر کر پیار کیا۔ زری نے اگلے روز پھر آنے کا وعدہ کیا۔ وہ چلی گئی اور میں امنگوں، آرزوؤں اور خوشیوں سے بھرا ہوا دل لے کر واپس اپنی بارک میں آ گیا۔ میری کایا ہی پلٹ گئی تھی یوں لگتا تھا جیسے قید کے پانچ برس یوں پانچ دنوں میں ختم ہو جائیں گے۔ زندگی میں ایک بار پھر نیا جوش اور نئی طاقت پیدا ہو گئی تھی۔ زری کی محبت اور بچے کے پیار نے میرے اندر ایک ایسا ولولہ

پیدا کر دیا تھا کہ میں طوفانوں سے بھی ٹکرا سکتا تھا۔

اگلے روز زری پھر بچے کو ساتھ لے کر مجھے ملنے آئی۔ وہ لاہور میں اپنے ماں باپ کے گھر کی بجائے اپنی ایک سہیلی کے ہاں ٹھہری ہوئی تھی۔ زری نے میرے اور میرے بچے کی خاطر اتنے بڑے گھر کی جائیداد کو ٹھکرا کر اتنی عظیم قربانی دی تھی کہ میں ساری زندگی اس کا بدلہ نہیں اتار سکتا تھا۔

میں نے کہا۔

"زری! میں اس قابل تو نہ تھا کہ تم مجھ سے اتنا مہربانی کا سلوک کرتیں۔"

زری نے کہا۔

"کچھ بھی ہو۔ آخر تم میرے خاوند ہو اور میرے بچے کے باپ ہو۔ عورت دوسرا بیاہ کر سکتی ہے۔ مگر اپنے بچے کو دوسرا باپ لا کر نہیں دے سکتی۔ اب ہمارا مرنا جینا ایک ساتھ ہوگا۔ میں، تم، اور ہمارا بچہ۔ قدرت نے ہماری زندگی کو خوشیوں سے مالا مال کر دیا ہے۔ ہم بڑے بدقسمت ہوں گے اگر ان خوشیوں سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے خاندان کی بنیاد نہ رکھ سکے"۔

میں نے کہا۔

"ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے زری! ہم نئے سرے سے اپنی نئی زندگی کا آغاز کریں گے۔ ہم ایک بالکل ہی نئے خاندان کی بنیاد رکھیں گے۔ جیل سے رہا ہونے کے بعد ہم اسی شہر میں یا کسی دوسری جگہ اپنا ایک الگ سکول بنائیں گے۔ جہاں بچوں کی ایسی تربیت کریں گے۔ انہیں ایسی تعلیم دیں گے کہ وہ بڑے ہو کر دولت اور روپے کی بجائے انسان کی خدمت کو ہی زندگی کی سب سے بڑی فتح سمجھیں"۔

زری کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

ٹھیک ہے۔ ہم ضرور سکول کھولیں گے۔ جب تک مجھے بھی سکول لائن کا کافی تجربہ ہوگا۔ لیکن یہ پانچ سال کی مدت تمہارے بغیر کیسے کٹے گی۔ یہ تو بڑی لمبی مدت ہے۔

میں نے کہا۔

"فکر نہ کرو زری! جیل میں میرا برتاؤ بڑا اچھا رہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ دو ایک سال کی مجھے معافی مل جائے گی"۔

"اب کل میں واپس ایبٹ آباد جا رہی ہوں۔ میری چھٹی ختم ہو رہی ہے۔ اگلے مہینے پھر آؤں گی۔ خط تمہیں برابر لکھتی رہوں گی۔ تم اپنا خیال رکھنا۔ اب تمہیں اپنے بچے کے لئے زندہ رہنا ہے"۔

زری واپس ایبٹ آباد چلی گئی۔ تین روز بعد اس کا خط مجھے

ملا۔ شاید یہ میری زندگی میں زری کا پہلا محبت بھرا خط تھا۔ اس خط میں ایک بیوی کا محبت اور خدمت بھرا دل پورے جوش پر تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

میرے پیارے میر تاج

ابھی دو روز ہوئے کہ تم سے ملاقات کر کے آئی ہوں۔ لیکن یوں لگتا ہے جیسے تم سے ملے صدیاں گذر گئی ہیں۔ تم سلاخوں کے پیچھے کھڑے تھے۔ اور اپنے بچے کو پیار کر رہے تھے۔ اور کبھی میری طرف محبت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے اور نہایت گرم جوشی سے میرا ہاتھ دبا رہے تھے۔ یہ سب کچھ خواب معلوم ہوتا ہے۔ اور اب جبکہ خواب ٹوٹ گیا ہے تو تم حقیقت کی دنیا میں کہیں نظر نہیں آتے۔ میری اداس نگاہیں چاروں طرف تمہیں ڈھونڈ رہی ہیں۔ میں نے اب اس حقیقت کو پوری طرح پا لیا ہے۔ کہ میں تمہارے بغیر، تمہارے سوا اور کسی شخص کے ساتھ بھی زندہ نہیں رہ سکتی تھی۔ چاہے وہ کسی ملک کا بادشاہ ہی کیوں نہ ہو۔ جانے کیوں میرا دل قیامت تک یہ بات گوارا نہیں کر سکتا کہ میرے سوا کوئی دوسری عورت تمہاری زندگی میں داخل ہو۔ جب میں پچھلے دنوں پر غور کرتی ہوں تو یقین

نہیں آتا کہ میں تم سے نفرت بھی کرتی تھی۔

جب غلین کا انکشاف ہوا تھا تو تم کس قدر پریشان رہتے تھے اور میں تماشا دیکھا کرتی تھی۔ خدا مجھے میری اس نادانی کو کبھی معاف نہیں کرے گا۔ آج یہ عالم ہے کہ ہر وقت دل تمہاری یاد سے بھارا رہتا ہے آنکھوں میں تمہاری شکل گھومتی رہتی ہے۔ کانوں میں صرف تمہاری آواز ہی سنائی دیتی ہے۔ آخر تمہارا بچہ دیکھ کر اسے پیار کر کے دل بہلا لیتی ہوں۔ کیونکہ اس کی شکل میں تمہاری صورت کا بھی ایک حصہ ہے۔

اب تو یہ حالت ہے کہ تم نظر نہ آؤ تو ہر چیز دھندلی اور غبار آلود دکھائی دیتی ہے۔ کوئی بھی شئے صاف طور پر دکھائی نہیں دیتی۔ گویا آنکھوں کے آگے پردے گر رہے ہیں۔ اور گرد و غبار کی دھند پھیل رہی ہے۔ پھر جب تمہیں دیکھ لیتی ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے ساون کی بوندیں ٹپاٹپ گرنے لگی ہیں۔ اور سارا گرد دھل گیا ہے۔ اور ہر شئے صاف ستھری دکھائی دینے لگتی ہے۔ یہ باتیں میں تمہیں اپنے دل کی زبان میں لکھ رہی ہوں۔ میں اپنا مطلب شاید صحیح طور پر ادا نہیں کر سکتی اور پھر تمہارے مقابلے میں میں زیادہ محبت کا اظہار بھی نہیں کر سکتی۔

تم مرد ہو اور مرد زندگی بھر عورت کو نہیں سمجھ سکتا۔ وہ عورت

کی محبت کی گہرائی کو کبھی نہیں ناپ سکتا۔ میں اپنی زبان سے اپنی محبت کا اظہار نہیں کر سکتی۔ لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ پچھلی باتوں کو بھلا کر اب میں اس دنیا میں صرف تمہارے اور تمہارے بچے کے لیے زندہ ہوں۔ اگر تم نہ ملے تو پھر میں زندگی کو قبول کرنے سے انکار کر دوں گی۔ میں جانتی ہوں کہ تم بھی مجھ سے محبت کرتے ہو۔ اور اب تم بالیقین ہمیشہ کے لیے میری زندگی میں داخل ہو چکے ہو۔ پھر بھی کسی وقت ڈر جاتی ہوں۔ دنیا والے بڑے ظالم ہیں۔ کہیں پھر بیچ میں دیوار کھڑی نہ کر دیں۔

کبھی کبھی میں بڑی جذباتی ہو جاتی ہوں۔ اس وقت میرا دل چاہنے لگتا ہے کہ آخر تم کیوں میرے پاس نہیں ہو۔ لوگوں نے تمہیں جیل کی چار دیواری میں کیوں بند کر رکھا ہے۔ اور اگر تم وہاں ہو تو پھر مجھے بھی تمہارے پاس آنے کی اجازت کیوں نہیں دیتے۔ لیکن پھر مجبور ہو کر خاموش ہو جاتی ہوں۔

اس وقت میں تمہیں اپنے ہوسٹل کے کمرے میں بیٹھ کر خط لکھ رہی ہوں۔ آیا ابھی ابھی منے کو لے کر باہر باغ میں گئی ہے۔ ذرا سی آہٹ ہوتی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے تم آ گئے ہو۔ لیکن ابھی تو پانچ سال کی طویل مدت باقی ہے۔ ابھی تو پانچ بہار کاٹنے ہیں۔ پانچ

دریا عبور کرنے ہیں۔ آپا ننھے کو لے کر آگئی ہے۔ وہ رو رہا ہے شاید اسے بھوک لگی ہے۔ اب میں خط بند کرتی ہوں۔ اپنا خیال رکھنا۔

ہمیشہ تمہاری

زری

میں نے یہ خط کئی بار پڑھا۔ یہاں تک کہ مجھے پورے کا پورا یاد ہو گیا۔ اس کا جواب بھی میں نے ویسا ہی محبت بھرا لکھا۔

وقت گذرتا گیا۔ دو برس گذر گئے۔ اس دوران میں میری بیوی ایبٹ آباد ہی میں نوکری کرتی رہی۔ وہ ہر ماہ مجھ سے ملنے آتی۔ میرا بیٹا بھی اب بیانا ہو گیا تھا۔ اور توتلی زبان میں باتیں کرنے لگا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر خوشی سے باہیں پھیلا دیتا۔

جیل والوں نے میرے اچھے چال چلن کی وجہ سے میری قید میں سے ڈیڑھ سال معاف کر دیئے۔ چنانچہ پورے تین سال اور چھ ماہ قید میں رہنے کے بعد میں جیل سے رہا ہو کر باہر آ گیا۔ زری بچے کو لے کر میرے استقبال کے لئے باہر کھڑی تھی۔ ہم دونوں وہاں سے اس کی سہیلی کے ہاں آ گئے۔ دوسرے روز ہم ایبٹ آباد آ گئے۔ جیل والوں نے مجھے کچھ روپے دیئے تھے۔ ہم نے ایک

مکان کرائے پر لے لیا۔ اس کے ایک حصّے میں ہم نے رہائش اختیار کر لی اور دوسرے حصّے میں سکول کھول دیا۔

محلے کے بچے پڑھنے آ گئے۔ دو مہینے بعد ہم نے ایک دوسرا مکان بھی کرائے پر لے لیا۔ سکول آہستہ آہستہ ترقی کرنے لگا۔ کوئی دو سال بعد ہم سکول شہر سے باہر ایک پرفضا مقام پر لے گئے۔

اس بات کو آج چھ سال گذر گئے ہیں۔ ہمارا بچہ ہمارے ہی سکول میں پڑھ رہا ہے۔ ہمارا اسکول کافی ترقی کر گیا ہے۔ زری کو خدا نے دو بچے اور دیئے ہیں۔ وہ دن بھر خدمت خلق کے کاموں میں اور سکول کی مصروفیات میں لگی رہتی ہے۔ میں سکول کا سارا بندوبست چلاتا ہوں۔ ایبٹ آباد شہر میں ہماری بے حد عزت ہے۔ مائیں اپنے بچوں کو ہمارے سکول میں لاتی ہیں تاکہ وہ اعلٰے تربیت حاصل کر سکیں۔ ہماری زندگی انتہائی سکون اور نیکی کے ساتھ بسر ہو رہی ہے۔ کیونکہ ہم نے لوگوں کی خدمت اور بھلائی کے جذبے کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا ہے۔ ورنہ مجھ ایسے مفرور ملزم اور قیدی کے یہ بھاگ کہاں کہ وہ چھ برس بعد ایک قابل احترام شخص بن جائے۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ میں نے گناہوں سے توبہ کر لی تھی اور اپنی زندگی کو دوسرے لوگوں کی خدمت

کے لئے، وقف کر دینے کی قسم کھائی تھی۔

ختم شد

اے حمید

خان محبوب طرزی

کا

اسلامی تاریخی ناول

زریاب

سہ رنگا حسین گردپوش

کتابت، طباعت عمدہ

قیمت ۳ روپے

(زیرِ طبع)

ناشر:- خالد بک ڈپو چوک انارکلی، لاہور



فہرست ۔ کتب

پھول گرتے ہیں	اے حمید	4/50
چشمے کا پتھر	,,	3/00
مرزا غالب رائل پارک میں	,,	3, 50
لڑکی اور جنگل	,,	3/50
دیکھو شہر لاہور	,,	3/50
ڈاک بنگلہ	,,	4/-
مسئلہ خلافت	ابوالکلام آزاد	3/-
قول فیصل	,,	1/50
جامع الشواھد	,,	1/50
دل کی وادیاں سوگئیں	کرشن چندر	3/50
الٹا درخت	,,	2/75
زہرآب	خان محبوب طرزی	3/00
فرعون و کلیم	رائیڈر ہیگرڈ	6/00
تیری صورت میری دنیا	عادل رشید	3/00
جنگ قادسیہ	مائل مسیح آبادی	4/50
سلطان محمد فتح	,,	4/-
جیل کے دن جیل کی راتیں	ابراھیم جلیس	3/50
جیون ساتھی	بصوب الحشی	2/62

ملنے کا پتہ

خالد بک ڈپو (پان گلی) چوک انار کلی لاہور

غازی پرنٹنگ پریس پان گلی چوک انار کلی لاہور

فہرست کتب

پھول گرتے ہیں	اے حمید	4/50
چشمے کا پتھر	,,	3/00
مرزا غالب رائل پارک میں	,,	3, 50
لڑکی اور جنگل	,,	3/50
دیکھو شہر لاہور	,,	3/50
ڈاک بنگلہ	,,	4/-
مسئلہ خلافت	ابوالکلام آزاد	3/-
قول فیصل	,,	1/50
جامع الشواہد	,,	1/50
دل کی وادیاں سوگئیں	کرشن چندر	3/50
الٹا درخت	,,	2/75
زہراب	خان محبوب طرزی	3/00
فرعون و کلیم	رائیڈر ہیگرڈ	6/00
تیری صورت میری دنیا	عادل رشید	3/00
جنگ قادسیہ	مائل مسیح آبادی	4/50
سلطان محمد فتح	,,	4/-
جیل کے دن جیل کی راتیں	ابراہیم جلیس	3/50
جیون ساتھی	بصوب الحشی	2/62

ملنے کا پتہ

خالد بک ڈپو (پان گلی) چوک انار کلی لاہور

غازی پرنٹنگ پریس پان گلی چوک انار کلی لاہور